

پیارے منوہر  
کے  
نام!

## ترتیب

۷	بیٹے بیٹیاں ،
۲۸	ماقم ،
۳۴	کھمبہا ،
۵۰	دُوربین ،
۶۱	شکنیں ،
۸۳	نصیب ،
۹۴	حُمّم بیگ ،
۱۰۶	وحشی ،
۱۱۵	جن دانس ،
۱۳۹	امانت ،

## میٹے پسیاں

ہادی کمار لے سوچا کہ کل تک تو نازد بالکل تھیک تھی۔ اگر آج اچانک اس کی آنکھوں میں چور بیان کیوں جلنے لگیں؟ نازد سے کٹوارے کر اُس نے پانی تو پی لیا، مگر پانی پیتے ہوئے بھی وہ کٹوارے کے افی پرستے اپنی بیٹی کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ نازد کٹوارے کو چلی گئی اور ہادی پاؤں چلا کر چاک گھمانے لگا۔ چاک پر گھومتی ہوئی ہندیا اس کی انگلی کے ہر س سے نئی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ ہندیا اپنی ہنگیں کی طرف جا رہی تھی۔

صحیح نہ تھتے ہی جب ہادی کی نظر نازد پر پڑی تراء سے یقین ہو گیا کہ وہ کل کے مقابلے میں آج کچھ زیادہ بدی ہوئی ہے اور اس کے گاؤں میں کچھ ایسی چمک سی ہے کہ اتنی چمک چوٹھے میں ہر تو ہندیا میں پانی اُبلتے گے۔

اسے دارث دادا یاد آگیا، جو اپنی آٹھ بیٹیوں کی دھوپ میں تپ کر گئیں ہو جکا تھا، وہ کہتا تھا، دو گواہیں کی آنکھوں میں چور بیان جلتی و میخسو تو انہیں فرد اکمیں چلا کر دو چاہے انہیں گھٹھڑی میں باندھ کر کسی کے دروازے پر ڈال آؤ۔ چور بی جلتی رہے تو مسالہ ختم ہو جاتا ہے اور دُنیا اندر ہو جاتی ہے دُنیا بھر کے ماں باپ کے لئے ہر بیٹی کی عمر حِودہ نہیں تو زیادہ سے زیادہ پندرہ سال ہوئی چاہتی ہے۔ اس کے بعد بیٹی مر جاتی ہے

او صورت پیدا ہو جاتی ہے۔“

ہادی کو اتنا یاد تھا کہ جن دنوں لامگنے کی باتیں ہو رہی تھیں تو اس کے ہاں مراد پیدا ہوا تھا اور بیوی بیٹا کے کر خدا کے ہاں سدھار گئی تھی۔ پھر جب لام لگی ہے تو مراد ”آبا، آما“ بول لیتا تھا اور صحن میں بھاگتا پھر تھا۔ اس وقت ناز و پانچ بھروسے سال کی تھی۔ میاں جی کے ہاں پہلا سیپارہ پڑھنے باتی تھی اور اب مراد بارہ سال کا ہے اس حساب سے ناز کی عمر ہوتی ہی کوئی کہا۔

ہادی کہا رچا رپانی پرستے گھبراہست میں اُترا۔ ناز و اس وقت پڑوس سے اُنگی ہوتی لستی میں مکمل ڈلی گھما رہی تھی۔ اس نے چونکہ کرباپ کی طرف دیکھا اور بولی وہ کیا ہے بابا؟“

”دکب سے اُنھی ہوتی ہو قم ہے“ ہادی نے پوچھا۔

”دیرے“ وہ حیران ہو گرد بولی۔ ”مسجد میں اذان ہو رہی تھی۔“

”تو مجھے کیوں نہیں اٹھا دیا؟“ وہ بولا۔ ”مجھے بِ نعیب نے توجہ بھی خبر کی نہ اڑ پڑھی ہے۔“ قضاہی پڑھی ہے۔ اور تم؟“ — تم نے ناز پڑھی ہے؟“

”نہیں بابا“ ناز نے جھینپک کر کہا۔

”منہ اندر ہے لانا یاد رکھی، نماز پڑھنا بھول گئیں بدھیب ہے“ ہادی نے اُسے خلاف معمول جھٹک دیا اور پچھاگی کے پتو سے آنکھیں ملتا تو ابا ہر جلا گیا۔

---

ہادی کا معمول سا ہو گیا کہ صبح کو آنکھ کھلتے ہی چادر کو ایک جھٹکے کے ساتھ پرے پھینک دیتا اور سوق یا جاگتی ہوتی نازو کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگتا۔ اسے پیشیں ہو گیا تھا کہ ہر نیتی صبح کے میں سے نازو نتی صورت اختیار کر لیتی ہے اور ایک صبح کو تو وہ نازو کو ایک لمحے کے لئے پہچان ہی نہ سکتا۔

اسوچ کے دن تھے راتیں بھیگ کر نکل ہو جاتی تھیں۔ آدمی رات کے بعد ہادی چادر اور ٹھلیتا اور جب صحیح کو اٹھاتا تو اس کے گھٹنے سینے سے لگ پچکے ہوتے۔ ایک روز باب پیٹی کو ٹھٹھے کے اندر سوتے مگر آدمی رات کو نازو اٹھی، چادر بغل میں ماری، چارپائی میں کو گھسیٹ کر آگئی میں لئے آئی اور جب کوڑ بجھنے سے ہادی کی آنکھ سکھلی اور اس نے نازو کو پکارا تو وہ بولی ۔ ”میں یہاں ہوں بابا۔ اندر کے پسینے سے باہر کی ٹھٹھر ٹھٹھر بھلی۔“

ہادی خاموش ہو گیا، مگر کچھ دیر کے بعد اس سے بھی محسوس ہوا کہ وہ پسینہ پسینہ ہوا جا رہا ہے۔ بستر بغل میں مار کر وہ بھی آگئی میں آگیا، رات بھر خلکی کے مارے گھٹھڑی بنا پڑا رہا اور صحیح کو اٹھاتا سے محسوس ہوا کہ کھرمی چارپائی پر کوئی سوتا ضرور رہا ہے مگر وہ نازو نہیں ہے۔ وہ تو کوئی عورت ہے۔

نازو پت لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا کالا تمد گھٹنون یہاں پڑھایا تھا اور چھپنیٹ کا سڑتا اس کے جسم پر کچھ یوں کس گیا تھا جیسے اس نے ایک بھی تحری سانس لی تو عجلہ جگہ سے سک جائے گا۔ نازو کی چوٹی اس کی گردن کے ارد گرد سانپ کی طرح پیٹ گئی تھی اور جو چادر اس نے اور پر اور ٹھنے کی بجائے نیچے پچھائی تھی، وہ زمین پر دھیر پڑی تھی۔

اپنک نازو نے ایک عجیب سی کروٹ لی کروٹ لیتے ہوئے اس نے جسم کو چارپائی کے موٹے بان کے ساتھ اتنی سختی سے رکڑا کہ بان پھر پھر بول اٹھا۔ وہ داہیں طرف پلٹی۔ پھر اٹھی ہو کر بائیں کروٹ آگئی، مگر دکی نہیں، بلکہ پھر سے چوت لیٹ گئی اور ہادی کو ایسا لگا جیسے نازو کے گزتے کا تھا بین پلانے کی طرح ٹوٹ کر اسے نزلا کر دے گا۔ وہ نازو پر جیسے بھپٹا۔ اسے جھنپخنور لئے کے لئے جھکا، مگر بڑھے ہوئے پا تھک کو یوں کھینچ لیا، جیسے وہ بے جانے بوجھے کسی غیر عورت کو پھوٹنے پلا تھا،

پھر وہ قریب قریب چلا اٹھا۔ ”نازد“

نازوں میں ہڑا کر اٹھی کہ اس کے کوئتے کا بیٹن سچ مج ٹوٹ گیا۔ پھر وہ کوئتے کے انہیں پک گئی اور ہادی باہر گئی میں آگیا مہان بھی رکا تھیں۔ بلکہ سیدھا نکلا چلا گیا، اور اس روز اس نے سب کماروں کے گھروں کے پکڑ لگا دالے۔ وہ ہر گھر میں جوان کماروں کو دھواں پھوڑتے ہوئے آؤں پر اپنے پکھاتے یا چاکوں پر اتنی تیرزی سے برتن بناتے دیکھتا رہا، جیسے برتن چاک میں سے اگتے چلے آ رہے ہوں۔ ہادی بے خدا سا کمار تھا۔ زکسی کے بینے میں تھامہ دینے میں۔ مینوں اپنے گھر ہی سے نہیں نکلا تھا اور کبھی نکلا بھی تو آوے سے اترے ہوئے برتن بخنے یا کسی کے آوے کا کوئی کونا کھدا امگنتے تاکہ دوسروں کے گھروں اور ہانڈیوں کے ساتھ اس کے برتن بھی پک جائیں۔ آوے کا ایک حصہ تو وہ ماںگ سکتا تھا مگر اپنی بیٹی کے لئے برکیسے ناگفتہ۔ اس بانکے سیدھے نوجوان کماروں کی طرف یوں دیکھتا رہا جیسے بچے مٹھائی کی طرف دیکھتے ہیں۔ نازد سے اسے جواب سا آئے لگا تھا۔ وہ جب اس کے سامنے کھانا لا کر رکھتی یا اس کے باختہ میں لستی کا کٹورا تھما تی، تو ہادی کا بھی چاہتا کہ وہ یہ دیکھنے کے لئے اُس کی آنکھوں میں جھلنکے کر دے اس چور تباہ ابھی تک جل رہی ہیں یا مساکن ختم ہو چکا ہے۔ مگر اس وقت اس کے ذہن میں نازد چار پانی کے موٹے بان پر اپنے جسم کو پھیلتی ہوتی دوہری کروٹ لیتی اور اسے نازد سے وحشت مونے لگتی۔ البتہ جب وہ غالی برتن لے کر داپس جاتی تو ہادی اس کی طرف دیکھتا ہے جنہی دونوں میں اس کا قد کتنا مبارک ہو گیا تھا، اور اس کے بازوں کے خطوط کیسے دیکھنے سے لگتے تھے اور وہ بالوں کا اتنا بڑا دھیر گھر کے کس گوشے میں لچک پ کر انکافی رہی تھی۔

---

پنچاگوں سے مایوس ہو کر وہ ایک دن قریب کے ایک اور گاؤں میں قائم تھا

اُرمانی کرنے جانکلائے چھوٹے سے اس گاؤں میں صرف ایک کھمار رہتا تھا، جو کسی پشت سے اس کا رشتہ ہار بھی تھا۔ اس کی دو جوان اولادیں تھیں۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ عرصہ ہوا اس کی بیوی مٹی کھوتے ہوئے مشی ہی کے ایک تو دے کے نیچے دب کر رکھی تھی۔ بیٹے بیٹی کو زندہ رکھنے کے لئے اس نے دون رات چاک چلا یا تھا اور چاک چلاتے ہوئے اس نے اتنی بار پاؤں کو حرج کرت دی تھی کہ بقول اس کے اگر کوئی چلتے ہوئے اتنی بار پاؤں ہلاستے تو کابل قندھار پہنچ جاتے۔

ہادی جب اس کے باہ پہنچا تو پورا کنہیری کے ساتے میں، ایک رنگین گھڑے کے اوپر درج مجمع تھا۔ بیٹوں میٹے بیٹی کو مشورہ دے رہا تھا اور وہ شرخ رنگ پر سبز اور سبزی بیل فٹے بنارہے تھے۔ وہ ان سے کہہ رہا تھا۔

”کلاں کے پھول اور گوبلی کے پھول میں بہت فرق ہوتا ہے دینا، اور دیکھ ری شرمنی۔ تو نے یہ چڑیا بنانی ہے کہ کمولی؟“

دینا اور شرمنی ہنس رہے تھے اور بیگو ایک باچھہ میں ٹھقے کی نال رکھے ڈھری باچھے سے مسکرا رہا تھا۔ ہادی کو یہ ماحول بڑا پیارا سالا گنا۔ پھلے چند دنوں سے اس نے اپنے دل کو اپنی سمجھی میں بند کر رکھا تھا۔ مگر بیگو کے ہمگن میں قدم رکھتے ہی اس کی گرفت ڈھینی پڑ گئی، اور اس کا دل کبوتر کی طرح پھر پھر آکر، جیسے ہیری کی ایک شاخ پر جا بیٹھا۔ بیگونے اسے دیکھا تو یوں ایک دم اٹھا کہ حق کی ٹوپی اپنے کی راکھ بھیرتی ایک دانتے میں دو رنگی لڑکتی چلی گئی، اور پھر حقے کے پاس دالپس آگئی۔ دینا اور شرمنی رنگوں کی پالیوں میں سرکشیوں کے سرے ڈبو کر رہ گئے۔ ہادی کے قریب جا کر بیگو بولا۔

”ہمیں تم ہادی نہیں ہو سکتے۔ تم ہادی ہوئے تو یہاں برسوں کے بعد نہ آتے۔ کل آتے جب دو گدھوں پر لندے ہوئے تمہارے کورے بر تنوں کے دلبورے میری گلی میں سے بولتے ہوئے گرد گئے اور تم نے پٹ کر بھی نہ دیکھا کہ یہ بیگو کا گھر ہے یا اس

کی قبر ہے اور اگر تم ہادی ہی ہو تو بڑے ہی بے حیا آدمی ہو۔“  
جب بیگو نے بات ختم کی تو اس کی آنکھیں بچیگ چکی تھیں۔ ہادی اس سے بچوں  
کی طرح پیٹ گیا، تو اس نے ہادی کی پیٹ پر زور کا ایک دھونکا مار کر اسے سینے سے  
ٹکالیا، اور پھر الگ ہو کر بولا۔

”تم ان لوگوں کو نہیں جانتے ہو گے۔ یہ میرا بیٹا ہے دینو، اور یہ میری بیٹی ہے  
شرفی۔— اور بچوں یہ بھی تھا اکتنی ہوتا سوتا ہے۔“

دینو نے بیری کے نیچے فور آیک لکھاٹ نچادی، شرفی نے اس پر بھیں نچھایا  
اور اس کے بعد دینو حقہ تازہ کرنے میں لگ گیا اور شرفی چونے کے پاس جائیجی، اور بیگو  
ہادی کے بازوں کو ٹوٹانے لگا۔

”بچ ریج بتاؤ، تم ہادی ہو کر کوئی بھوت ہو۔“ وہ بولا۔ مجھے تمہارا کتنا انتظار تھا ہادی؟“  
اور ہادی سوچنے لگا کہ آخر بیگو کو اس کا کام ہے کو انتظار تھا۔ انتظار تو بیٹی کے باپ  
کو ہوتا ہے۔ بیٹے کا باپ تو انتظار نہیں کرتا۔ بیٹے کے باپ کا تو انتظار کیا جاتا ہے؟ وہ تو  
انتظار کر رہا ہے۔

”تھیں کام ہے کو انتظار تھا میرا؟“ ہادی نے بہت کر کے بیگو سے پوچھ دیا۔  
اور بیگو، دُور کونے میں بیٹھی ہوئی شرفی کی طرف دیکھو کر آہستہ سے بولا۔“ میں

ایک بیٹی کا باپ ہوں ہادی۔“

ہادی کا دل بیری کی شاخ پر سے جیسے پھر پھرا کر گرا، اور اس کی بھنپی ہوتی تھی  
میں گھس گیا۔ پھر اس نے اپنے آپ کو سمجھانا پا ۔۔۔ تھیک ہے، بیگو کی بیٹی بھی تو ہے۔“  
دینو نے حقہ لا کر ہادی کے سامنے رکھ دیا، اور بولا۔“ بامیں ذرا فسایوں کے  
ہاں جاتا ہوں۔ شاید گوشت بتوا ہو۔“

”ہاں ہاں!“ بیگو بولا۔“ ضرور جاؤ۔ گوشت نہ ملے تو ولی کے ہاں سے ایک چڑہ

پھر تے لانا۔ کہنا اگلا آدہ اترنے پر اکٹھے دس گھنٹے پنچا دوں گا۔ ہادی روز و نہ تو  
نہیں آتے گا یا ہے؟

دنیو چلا گیا۔ شرمنی جو چوڑے میں پھونکیں مار مار کر آنکھوں اور چہرے کو لال کر جائی  
تھی اٹھی۔ دوپتے کو بڑے قرینے سے پیٹا اور گھٹرا اٹھاتے بیری کی طرف آنے لگی  
جس پر بہن بھائی نقش وزنگار ابھارتے ہے تھے۔

«کہیں حفاظت سے رکھنا بیٹی، بیگونے کہا۔ اُد پر کوئی کپڑا ڈال دینا، کھیاں مجھ  
گیئیں تو ناس مار دیں گی،» پھر وہ ہادی سے مخاطب ہوا۔ «صوبیدار کے بیٹے کی شادی ہے۔  
اکتوبر ابڑا ہے۔ صوبیدار نے کہا ہے۔ ایسی گھروں، بناؤ کہ علاقے میں نام نکل جائے۔  
ولہن کی سیلیاں دیے تو پنگھٹ پر، گھروں بھرنے جاتی ہیں نا، صوبیدار کہہ رہا تھا کہ وہ  
اس گھروں کو عرق گلاب سے بھروادے گا، بہت کھانا آپیتا ہے، گاؤں کا سردار ہے جو  
روپے پشن بلتی ہے۔»

«تمہیں کیا ملے گا؟» ہادی نے پوچھا۔

«دوسرے ایک دیتے ہیں، بیگو بولا۔ یہ پانچ دے گا۔ شاید زیادہ بھی دے دے۔  
حوالہ دالا آدمی ہے۔ مجھے تو۔۔۔» بیگو رک گیا اور جب شرمنی گھٹرا اٹھا کر کوئی  
میں پلی گئی تو آہستہ سے بولا۔ مجھے تو ان کل ایک ایک پیسے کی ضرورت ہے۔ آخر ایک  
جو ان بیٹی کا باپ ہوں۔»

«ایک جوان بیٹے کے باپ بھی تو ہو۔» ہادی نے کہا اور فوراً پچھتا نے لگا، کہ اُس  
نے ایسا کیوں کہہ دیا۔ دونوں ہاتوں میں آخر رشتہ کون ساتھا، اُس نے ٹھپر کر بیگو کی طرف  
دیکھا، مگر بیگو تو مسکرا رہا تھا، دہ بولا۔۔۔

«تم ٹھیک کہتے ہو۔ بس اسی سماں سے تو زندہ ہوں، مگر ایک جوان بیٹی کا باپ  
ہوں تو میرا ایک جوان بیٹا بھی تو ہے۔ کوئی بیٹی کا پوچھنے آتے تو بیٹے کا رشتہ دسکے

جاتے۔ کسی نے بیٹے کی بات کی تو بیٹی کے رشتے کی شرط لگا دوں گا۔ ایک لے جاؤ۔ ایک دے جاؤ۔ حساب برابر۔ پر کوئی پوچھتا بھی تو نہیں۔ دینوں تھاڑہ سال کا ہے۔ مشرنی ایک سال جھوٹی ہے۔ ان کے ہم عمروں کے ہاں دو دو تین تین پتھے ہیں اور یہاں ان کی جوانیاں ٹھلی جا رہی ہیں۔“

بادی کو بیگونے جیسے کہ ہوں سے پکڑ کر چاک طرح گھادیا، انہی چکروں میں، وہ بیگوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ڈی بے خیانی سے بولا۔ اور اگر میں کھوں کہ میں اپنی نازد کو تمہارے دینو کے حوالے کرتا ہوں؟“

«تو میں کھوں گا۔» بیگونے بھی اسی بے خیانی سے، بلکہ ذرا سامسکرا کر کہا۔ «تو میں کھوں گا کہ میں اپنی مشرنی کو تمہارے مراد کے حوالے کرتا ہوں۔“

«مراد ہے۔» بادی یوں چلایا، جیسے دونوں ویرانے میں بیٹھے ہیں؛ اور ان کے آس پاس میلوں تک کوئی آدم زاد موجود نہیں ہے، پھر اُس نے پونک کر چکھے کے ساتھ بسلی ہوئی مشرنی کی طرف دیکھا اور بہت مدھم سرگوشی میں بولا۔

«مراد ہے ارے وہ تو ابھی ذرا سائیک کا ہے۔ بلکل گیارہ بارہ سال تو اُس کی عمر ہے۔“

«بندیا دنڈیا تو بنایتا ہو گا۔» بیگونے جیسے بادی کی اطلاع سُنی ہی نہیں تھی۔

اور بادی بولا۔ ارے اُس نے تو مٹی کو چھوٹا تک نہیں، وہ تو مسجد میں پلاسیپاڑ پڑھ رہا تھا، جب تک عالم غلی کا بیٹھا اُسے لاہور لے گیا۔ وہاں وہ لائٹ صاحب کے دفتر میں نوکر ہے اور مراد اُس کا نوکر ہے۔ مُٹنا ہے اب تو پلاؤ تک بنایتا ہے۔“

«اچھا تو وہ لاہور میں ہے؟“

«ہاں پانچ سال کا تھا، جب تم نے دیکھا تھا۔ اب گیارہ بارہ کا ہو گا۔“

بیگونے ہنس کر کہا۔ سدا گیارہ بارہ کا تو نہیں رہے گا۔ پانچ چھوٹے سال میں دینوں سے بھی تہذیکاں سے جائے گا۔ تمہارے باپ دادا تو پھر فٹے جوان تھے۔ تم بھی کسی سے

کم نہیں ہو، میرا سر تھاری چھوڑی کو چھوڑتا ہے۔ بچوں کا کیا ہے کہ دکی ہیں کی طرح بڑتے ہیں۔ صبح یہاں ہیں شام کو دہاں پہنچ رہے ہیں۔“

بادی کو یہ بات معلم نہ کر سکی، آگے کھسک کر، بیگو کے کندھے پر ٹاٹھ رکھا اور بولا  
”شادی کی ایک عمر ہوتی ہے نا۔ مراد کی ابھی شادی کی عمر کہاں؟“

”یوں بھی ہوتا ہے۔“ بیگو بولا۔ ”کہ شادی کی عمر آتی، اور گزر گئی مادر فصیبہ ہی نہ جاگتا۔“  
بادی نے ایک بار تو فیصلہ کر لیا کہ وہ بیگو سے سمجھی بات کہہ دے مگر پھر محسوس کیا  
کہ بات کھتے ہوئے اس کی زبان چڑھائے گی۔ وہ اس سے کیسے بتانا کہ میرے لئے تو اپنی  
پندرہ سال کی نازد ہی مصیبت بن گئی ہے۔ میں تماری سترہ برس کی شرفی پر مرافعے جوان  
ہونے لہک کہاں پھرے دیتا پھر دل گا، اور جوانیاں جب آتی ہیں تو یونہی چکپے سے نہیں  
کھسک جاتیں۔ وہ تو پیر دل کی طرح نذرانے مانگتی ہیں۔ اور ہم غربی ہوں کی بیٹیاں اگر نذرانے  
ہانٹتی پھریں تو عمر بھر کوئی تھوکے بھی نہیں۔

”بھتی سمجھی بات ہے۔“ آخر بادی کو صرف یہ کہنے کی توفیق ہوتی۔ ”مراد بہت چھوٹا  
ہے۔“ پھر وہ اس ڈر کے مارے کہ کہیں بیگو پہنچے سے زبول دے۔ فوراً کہنے لگا۔ ”دنیو  
کے لئے میری نازد موجود ہے۔ شرفی کے لئے برڈ ڈھونڈنا میرا ذمہ رہا۔“  
بیگو حقے کو ایک طرف ہٹا کر، بڑی سمجھیدگی سے اور نہایت چھجھتے ہوئے لہجے  
میں بولا۔

”اگر ایسی ہی بات ہے تو تم میری شرفی کے لئے بُرگیوں ڈھونڈتے پھر د۔  
اپنی نازد کے لئے کیوں نہ ڈھونڈو۔“ پاؤں لٹکا کر اس نے جوتا پہنا اور  
بولا۔ ”صرف اپنی بھٹی کا باپ بن کر ملت سوچ۔ بیٹیاں دوسروں کی بھی ہوتی ہیں  
اور وہ انہیں بھی بڑی پیاری ہوتی ہیں۔“ اور وہ حقے پر سے ٹوپی آتا کہ چُلھے کی  
طرف اس تیزی سے بڑھا جیسے فوراً نہ پہنچا تو آگ بچھ جاتے گی۔

ہادی یوں سکر کر رہ گیا جیسے بیگونے ہاتھ کے ایک بھلکے سے اس کے سارے  
کپڑے اتار کر پھینک دیتے ہیں، اس کا جی چاہا کہ باپ بیٹی کی آنکھوں بچا کر کھسک جاتے  
اور لگاؤں کی گلیوں میں سے سر پٹ بھاگتا ہوا اتنی دور تک جاتے جہاں اُسے مرتے وہ  
بک بیگو کا سامنا کرنا پڑے۔ بیگو کے سامنے وہ کتنا چھوٹا سا ہو کر رہ گیا تھا، بالکل  
چورا سا۔

”کش رکاو گے ہے“ بیگو نے جیسے اس کے سر پر گول اچھوڑ دیا۔ پھر وہ اس کے پاس  
بیٹھتے ہوئے بولا:-

”لگھبرا کیوں لگتے ہو ہادی۔ میں جانتا ہوں، تم کیا سوچ رہے ہے۔ ہو، میں یہ بھی جانتا  
ہوں، کہ تم آج برسوں کے بعد میرے پاس کیوں آنکھے ہو، اور یہ بھی بتا دوں، کہ تم نہ  
آتے تو خود میں چند دنوں میں تمارے پاس آنکھتا۔“

ہادی کی ڈھارس بندھی۔ بیگو کی طرف دیکھے بغیر، چند کش لگاتے اور نال کو گھما کر بیگو  
کو نکھانا چاہتا تھا، جب بیگو نے اس کے ہاتھ پر پانچ روکھ دیا اور ٹبری نرمی سے بولا۔

”سنوا! یوں کیوں نہ کریں؟“  
”ہادی نے پوچھا ہے کیا؟“

بیگو بولا۔ ”دینو، تمara داما دبن جاتے اور تم میرے ہے۔“

”میں!“ ہادی ایک بار پھر پچھا اٹھا، اُس نے تڑپ کر شرقی کی طرف دیکھا، جو  
سرماہی میں پچھے چلا رہی تھی۔ پھر اس کے کھسک کر، وہ بیگو کے گھٹنے پر گھٹنا رکھتے ہوئے  
بولا۔ ”میں کیسے؟“

بیگو نے اس کے بازو کو تچھپا کر کہا۔ پس پیشیوں پر، ہاؤں کی ذرا سی سفیدی سے  
دو گ دوڑھے نہیں ہو جاتے اور تم تو ابھی چالیس برس کے بھی نہیں ہو گے، مجھے تو تمہاری  
پیدائش تک یاد ہے، میں تو ان دونوں اچھا خاصا میانا تھا۔ میانوالی کے بازار میں

چار گھنٹے اور صحنکیں بیج آتا تھا۔“

”پر میں کیسے بھتی میگو۔“ ہادی نے فرمادی کہ ”دنیا کیا کئے گی۔ دنیا تو یہی کئے گی کہ اپنی شادی کی خاطر بیٹی کا سودا کر لیا۔“

بیگو بولا۔“ اور دنیا اس وقت کیا کئے گی، جب تمہاری بیٹی کنواری بیٹھے بیٹھے بیٹھے بیٹھے ہو رہی ہو جائے گی اور پھر دنیا کا کیا ہے۔ دنیا کی زبان نے تو کمی نیک پاک پر دد داؤں کو بھی معاف نہیں کیا۔ تمہاری میری بیٹیاں تو تمہاری ہیں۔ مٹی ڈھونے اور برلن بیچنے، اور بچتیں بیٹنے والیاں۔ ان پر قو لوگ جب چاہیں بدنامیوں کے ٹوکرے الٹ دیں۔“

ہادی نے رُکتے رُکتے کہا۔ ”بچ کئے ہو۔ پر میں تو —“

اُپر سے دینو چھنٹا چلتا ہوا، ایک چونہ پڑے آگیا اور بات دیہیں ختم ہو گئی۔ پھر، جب دن ڈھلے ہادی نے واپس گاؤں جانماچا اتو دینوں نے شرمنی کو پکارا۔

”ادھر اُ شرف۔ چاچا جا رہا ہے۔“

شرفو ذرا سی لاکی طرح بھاگتی ہرمنی آئی اور ہادی کے سامنے مسکراتی ہوئی گھنٹی۔ مگر ہادی کے تیور دیکھ کر جیسے دینو کے پیچے بھنپنے کی کوشش کرنے لگی۔ ہادی نے گھبراہٹ میں دینو سے بھی باختہ نہ ملایا اور دلوں بھائی ہیں جس پچاپ وہیں بیڑی کے پیچے کھڑے رہ گئے۔

گلی کے سرے پر پہنچ کر بیگو نے ہادی کو بھینپ کر سینے سے لگایا، اور پھر باختہ ملاتے ہوئے دیکھا۔ ”تو پھر وہ بات میک ہے نا۔“

”میک ہے۔“ ہادی نے زجائے اس دوران میں کب فیصلہ کر لیا تھا، اور بیگو نے اسے ایک بار پھر سینے سے لگایا۔

نازدیکی شادی کے بعد، ہادی گھر سے باہر ہوتا، قو لوگوں سے چھپتا پھرتا اور گھر آتا، تو

مرثی سے کرتا آہتا۔ رات کو جب شری، برتن دھوکر فارغ ہوجاتی، اور کواڑ بند کر کے اور دیا بھجا کر، اپنی چارپائی پر پڑ رہتی، تو ہادی کتنی دیر تک اندر ہیرے میں گھوڑتا رہتا، آنکھیں بند کرتے ہوتے، اسے ڈر لگتا۔ کیونکہ اس طرح اندر ہیرا چکنے لگتا تھا اور چار طرف سے انار سے چھوٹنے لگتے تھے۔ وہ کتنی بار آہستہ سے کواڑ کھول کر صحن میں نکل جاتا اور مالگہ اور پوس کی ٹھنڈی راتوں میں، دیر تک ادھر سے ادھر گھومتا رہتا۔ اس دوران میں وہ شری کے پارے میں سوچتا رہتا۔ کبھی وہ اسے زمین مگھڑیں، پر چڑیوں کی تصویریں بناتی نظر آتی اور کبھی چولے میں پیوں کیسیں مارتے تھاں کرماختی، اور تپا ہوا چھرا اور دیکی ہوتی آنکھیں نے اس کی طرف آہستہ آہستہ بڑھنے لگتی اور ہادی کاجی چاہتا کہ وہ آگے بڑھ کر اپنی چادر کے پتوسے، اس کی بھیگی ہوئی ترخ آنکھیں پوچھ ڈالے، اور اس کے چہرے کو کتاب کی طرح اپنے دلوں ہاتھوں میں لے کر اس سے کہے۔

”شری، اب کیا ہو گا؟“

اور ایک روز دہنچ بستہ اندر ہیرے میں ٹھلتے ٹھلتے اچانک کوٹھے کی طرف بڑھا آہستہ سے کواڑ کھول کر اندر گیا۔ کواڑ بند کر کے، دیا ساتی اٹھائی اور دیا جلا دیا۔ پھر وہ پنجوں کے بل شری کے پاس آیا۔ وہ آنکھوں پر بازو رکھے سورپی تھی اور اس کے بالوں کی ایک لٹ، یعنی فرش تک پہنچ رہی تھی۔ ہادی نے لٹ کو، اس پنجوں کی طرح جھوٹا، جو زرا سے مس سے پتی پتی ہو کر کبھر جاتا ہے۔ مگر شری کو جیسے اس مس نے بھی جب پنجوڑا اللادہ تڑپ کر اٹھنی اور ہادی کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ پھر اس نے تیز تیز سافیں لیتے ہوئے، حواس باختہ، ہادی کو کھینچ کر چارپائی پر بٹھایا اور اس کے گھنٹوں پر سر رکھ کر پتھے کی طرح سسکنے لگی۔ پھر اس نے ہادی کو ناقابل یقین قوت کے ساتھ، اپنی طرف کھینچ کر اپنے گال اس کی دو روز کی بڑھی ہوتی دارجی سے رکڑ ڈالے، اور اس کے کندھوں پر سر رکھ کر کچھ اس طرح مچل کر رونے لگی۔ جیسے ہادی نے اُسے برداشت نہ روکا تو وہ آنسو بن کر بہر جاتے گی۔

کڑوے تیل کے دیتے کی سیلی زرد روشنی میں بُست کی طرح بیٹھے ہوتے ہادی کو اس عجیب دغیریب لمحے میں سوائے اس کے کوئی بات نہ سمجھی کر دہ بھی نہ فنگے، مگر دہ روپا نہیں۔ شرفی کو زمی سے الگ کر کے اٹھا۔ دیتے کے پاس جا کر تینی سے اس کی نو بلند کر دی، اور پھر اُسے اٹھا کر شرفی کے پاس لے آیا۔ دیتے کو شرفی کے پاس لے جا کر دہ پانگلوں کی طرح اُسے گھوڑے لگا۔ شرفی، لمحے بھر کے لئے تو گھبرا کر رونا بھول گئی، اور صرف دو ایک سسکیوں نے اس کے چہرے کو ذرا سا جھکتا دیا۔ پھر اُس نے آنسوؤں سے بھیگے ہوتے گا لوں پر چھٹے ہوتے ہاؤں کو ہٹایا، اور مسکرانے لگی۔ دہ اپنا چہرہ دیتے سے اتنا قریب لے آئی کہ اگر ہادی اسے فوراً نہ ہٹا لیتا، تو اس کی پیکیں جل جاتیں۔ دیتے کو زمین پر رکھ کر ہادی اٹھا، اور اپنی چادر کے پتو سے شرفی کی آنکھیں اور چہرہ پوچھنے لگا اور شرفی بچوں کی طرح ٹھوڑی اٹھاتے میٹھی رہی۔ پھر ہادی نے اس کے بالوں کو کافوں کے پیچے اٹکا کر دیا اٹھایا، اور طاقتے پر رکھ دی پھونکا مار دی، اور اس کو اس نے شرفی کے سر کو اپنے کندھے پر رکھ دیا اور اس کے بالوں کے نیچے ہاتھ لے کر اس کی گردن کھجاتے ہوتے بولا۔ "شرفی؟"

شرفی نے اس سے بھیخ کر کہا۔ "اللہ کا شکر ہے، تم میرا نام تو جانتے ہو؟" چھ سات سال کے عرصے میں ہادی نے اتنے گھرے، صحنکیں، پیلے، ہاندیاں اور سرپوش بناؤالے کہ اس کے ہم عمر کماردوں نے اپنی ساری عمر میں بھی شاید ہی بملے ہوں۔ منی کو بھگوتی اور اُسے آٹے کی طرح گوندھتی ہوئی شرفی، ہوئے ہوئے گیت گلگناتی اور منی کو چاک پر رکھ کر، ہادی اس گیت کے تال پر برتن بناتا اور جبب یہ برتن آوے سے پک کر آتے اور ہادی ایک لفکری یا انگشت شہادت کے جوڑ سے، سب برتنوں کو ایک ایک سر کے بجا تا، تو دہ کاشی کے کٹوروں کی طرح گلگناتے اور ہادی کہتا۔

”شرفی اپنی آواز سُن رہی ہو ہے۔“  
 شرفی اس کی طرف بڑے پایا سے دیکھتی۔ پھر اگر شادی کسی ٹوٹے ہوتے برتن  
 کو بجا بیٹھتا، تو شرفی ترطیب کر کرتی۔ ہادی۔ اپنی آواز سُن رہے ہو،“ دونوں زور زور  
 سے ہنتے اور پڑوسی ان کی بیٹھی کی آواز سُن کر سکتے، کہ شرفی کامن شادی کے روز جہاں  
 تھا وہیں اُڑ گیا ہے اور ہادی پھر سے جوان ہو رہا ہے۔ شرفی کنوئیں سے پانی بھر کر  
 لاتی تو عورتوں کی بھی باتیں ہادی کو سناتی، اور ہادی کہتا۔ شرع میں کیا شرم ہے شرفی۔  
 ٹھیک ہی تو ہے۔ میں جوان نہیں ہو رہا تو کیا بڑھا ہو رہا ہوں؟ پچھ سات سال ہو گئے۔  
 سمجھی سر میں درد تک نہیں ہوا کہ بڑھا پے کی شکایت میں بیٹھوں۔ سماں تک بھول  
 گیا ہوں۔“

اس عرصے میں شرفی کے ایک بیٹا ہوا، مگر دو دن بعد مر گیا، اور شرفی رو دھو  
 کر اپنے دوا داروں میں صرفوف ہو گئی، پھر بیگونے کا شکار ہو گیا۔ شرفی نے میکے جا کر  
 چند روز بین کئے، اور واپس آگر اپنے کاموں میں لگ گئی۔ دینوں، نازد کوئے کمزۇنى  
 کرنے والی پور کی طرف نکل گیا اور کچھ عرصے کے بعد، وہاں سے خط لکھا، کہم نے بیس  
 بچوں پیری ڈال لے ہے۔ گاؤں میں اسکے کیا کریں۔ مٹی کے برتوں کا رواج اُٹھ رہا ہے۔ ہم خود  
 چینی کے پیالوں میں چائے پیتے ہیں۔

دو تین بار مراد بھی چھپی پڑا۔ ایسے ٹھاٹھ تھے جیسے بی اے پاس کر آیا ہے۔  
 اپنے علاقے کی زبان تک پھول گیا تھا۔ ”جاداں گے۔ یاداں گے۔“ یوتا تھا۔ بالوں میں  
 ایسے تیل ڈالتا تھا کہ جہاں سے گزتا تھا، گزدن تک لوگ لمبی لمبی سانسیں لیتے رہ جاتے۔  
 جب وہ آخری بار آیا تو اس نے والدھی موچیں صاف کر کھی تھیں؛ اور ایک پھکتی ہوئی  
 پاٹپ میں بچکے کامگریٹ رکھ کر پیتا تھا۔ اور تھے یوں ایک دم بڑھ گیا تھا جیسے کسی نے  
 اسے سراور پاؤں سے پکڑ کر کھینچ دیا ہے۔ وہ ہادی اور شرفی کے لئے قسم قسم کی چیزیں

لے آیا۔ بسکٹ اور رنگین کاغذ میں لپٹی ہوئی مٹھائیاں اور سمندری سکنگی، اور طباقی طباق بھر کے آئینے، مگر جب واپس گیا، تو اپنے چیخچے بہت تیر خوشبو چھوڑ گی، اور خوبصورتی کو کھماڑ پکڑ کر عشق کرتا ہے اور اس نے غصب یہ ڈھایا ہے کہ ایک دھوین کو لیڈی تملٹن کا تمدا در عطر کی دو شیشیاں دے گیا ہے اور دھوین کی ماں نے یہ مینوں پھریں پکڑ لی ہیں اور اپنے صندوق میں رکھ لی ہیں۔

یہ فجر جب ہادی تک پہنچی تو اس کی صورت کچھ ایسی محل آئی، جیسے اس کی زندگی کے چھ سات برس، میں ایک پل میں گذر گئے۔ اور وہ اچانک بوٹھا ہو گیا ہے۔ شرمنی بھی دن بھر کھوئی کھوئی سی رہی۔ رات دیر تک امیاں بیوی میٹھے مشورے کرتے رہے اور آخر فیصلہ کیا کہ مراد کے لئے جلدی سے کوئی رشتہ دھونڈا بلتنے اور لاہور سے بلاکر اس کا بیاہ کر دیا جاتے۔

ابھی ورنوں رشتے کا سرانح لگانے میں مصروف تھے، جب ایک شام کو مراد سر پر بکس اور بستر کے گھر آگیا۔ ہادی نے وجہ پوچھی، تو معلوم ہوا کہ ملک عالم علی کے بیٹے نے جواب دے دیا ہے۔ کہا ہے تم ہست بڑے ہو گئے ہو اور مجھے تو چھوٹی عمر کا لوگر چاہتے۔ یعنی پارادنوں کے بعد، ملک عالم علی نے ہادی کو اپنے ماں بلایا اور اسے اپنے بیٹے کا خط پڑھ کر سنایا۔ مکھا تھا کہ مراد نے یہاں میری برسوں کی عزت پر پانی پھیر دیا ہے۔ اُس نے پڑوس کی ایک ذکر ان کے ہاتھ پر اپنی ساری تخلیہ رکھ دی، اور رات کو اُسے اپنی کوٹھڑی میں لے آیا۔ وہ تو اتفاق ہو گیا کہ مجھے اسی وقت کسی ضرورت سے اس کی کوٹھڑی میں جانا پڑا۔ ذکر ان کو میں نے دھکے مار کر نکال دیا اور مراد کو کرایہ دے کر اسی لمحے گاڑی میں بٹھا دیا۔ مگر پڑوس کے نوکر دن کو سارا قصہ معلوم ہو گیا اور دوسرے دن بات میرے دفتر تک پہنچ گئی۔ اپنے ہادی سے کہتے کہ اپنے بیٹے کو ہاندھ کر رکھے۔ مکھن تو سس کھاتے کھاتے اس کا ہاضمہ بھجو گیا ہے۔

ہادی واپس گھر اک مرثی کو بولنے میں لے گیا، اور اسے سارا قصہ سنایا۔ مرثی کچھ دیر تک ٹھوڑی کوئی نہیں ملتے سوچتی رہی پھر لوئی۔

”بندی سے اس کی شادی کا بند و بست کرد ورنہ ہمیں بھی لا تپور ملستان کی راہ یعنی پڑے گی۔ تم بھی کوشش کرو۔ میں بھی کرتی ہوں۔ تم سو روپیہ جو جمع کر دکھا ہے اسے چادر کے پتوں میں باندھو اور لڑکی کی تلاش نہیں ہمارا تھا جاسکتے ہو جاؤ۔ مراد، اگر لاث کے شر میں ایسا کر سکتا ہے تو صوبیدار کے گاؤں میں تو وہ نہ جائے کیا کر۔ میظھے کا۔ بیٹا بیٹی، بہت پیاری چیزیں ہوتی ہیں۔ مگر جوان ہو جائیں تو یوں سمجھو کر تمہارے صحن میں سونے کی ایک ٹلی پڑی را گئی ہے اور تم گھر سے کوئوں دُور چلے گئے ہو۔ جس کی آنکھ پڑے گی، پکے لے گا۔“

ہادی ایک شانیے کے لئے حیران ہوا کہ مرثی اتنی بہت سی دانائیاں کہاں سے جمع کرتی رہی ہے۔ مگر اس وقت لگنا تما ہوا مراد سختے کی ٹوپی ہاتھ میں لئے چوڑھے کی طرف جاتے ہوئے دروازے کے سامنے سے گز دیکھا۔ اور ہادی سنجھل بیٹھا۔

”ٹھیک کہتی ہوئی اس نے کہا: ”بہت ٹھیک کہتی ہوئی۔“  
اس نے ایک لمبی سانس لی۔ چادر اٹھا کر کندھے پر رکھی اور صحن میں آگیا۔ مراد کو اپنے پاس بلایا، اور پر لی طرف دیوار کے سامنے میں لے جا کر اسے مکہ عالم علی کے بیٹے کے خط کا سارا مضمون سنادیا۔

”بنتا ہے۔“ مراد بولا۔ ”خود جو کچھ کرتا پھر رہا ہے، وہ میں بتا دوں تو عالم علی کو دنیا کی نظرؤں سے چھیننے کے لئے کنوں میں میں کو دجا ناپڑے اور خود عالم علی کہاں کا فرشتہ ہے۔ اس کے بیٹے نے مجھے اس کے سارے کرتو توں کے تلقے سناتے ہیں۔“  
”تم کہا رہوئے ہیے کو ڈانٹنے کے لئے ہادی کو صرف یہی الفاظ سوچھ سکے۔

مراد فوراً بولا۔ ”کہا رکا بیٹا ہوں اس لئے کہا رہیں کہ ملاؤں گا، تو کیا مک

کھلاؤں گا۔“

ہادی پر ایک دم پانی پڑ گیا جیسے سب کیا دھرا اسی کا ہے۔

”ٹھیک ہے“ اس نے کہا۔ ”قصور میرا ہی ہے اور یہ بھی میرا ہی قصور ہے کہ تھیں لا ہو سچع دیا۔ تمہیں شہروں کی ہوا گئنے دی، اور تمہیں اتنا بھی نہ بتا سکا کہ کھاروں کی بھی عزت ہوتی ہے اور اس عزت کی خلافت کھارہ ہی کرتے ہیں۔“

”تو آبا۔“ مراد اس کے بالکل فریب آکر اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر بولا۔

”یہ بتاؤ کہ جب تم اس بڑھاپے میں ایک جوان لڑکی سے شادی کرنے کے لئے اپنی جوان بیٹی کا سوڈا کر رہے تھے تو اس وقت کھاروں کی عزت۔“

ہادی نے مراد کے منہ پر اس زور کا کھڑا رکھ دیا، کہ منڈیر پر سے چڑیاں اڑ گئیں اور دہلی پر ٹھیک ہوتی شرفی گیند کی طرح اچھل گئی۔ مراد ہنگاب کا کھڑا رکھ رہا دی نے زار زار رو تے ہوتے چاہو رکا ایک پومنہ میں ٹھونس لیا اور دیوار کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا شرفی اس کی طرف بھاگی۔ مراد بھی پٹا اور شرفی سے پہلے ہی اپنے بازو سے ہادی کو لپیٹ لیا۔

”تمہیں آتا“ دہ بولا۔ ”مجھے معاف کر دو۔ میں تمہارے پاؤں چھوٹا ہوں۔ اُس نے جھوٹا خاطر لکھا، اس نے مجھے خفہ آگیا۔“

شرفی ایک طرف کھڑی، ہادی اور مراد کی طرف دیکھتی رہی اور جب ہادی نے آنسو پوچھ کر اس کی طرف پڑے ہوئے پنجے کی طرح دیکھا، تو یوں دیکھتا رہ گیا، جیسے پوچھ رہا ہے ”تو کیا تم نے ساری باتیں سُن لی ہیں؟“ — مگر شرفی ایسے پر ہاؤں کی تھیں باتے کھڑی رہی، اور جب مراد رہاں سے اٹھ کر ایک طرف جانے لگا تو اس نے ہادی کا بازو پھر مکر اسے اٹھایا، اس کے کپڑوں کی گرد جھاڑی اور آہستہ سے بولی۔

بادی جیسا میں نے کہا تھا ویسا کرو۔ میں بھی جانتی ہوں کہ انہاں اچار سے کھائیں گے۔

ہادی نے اس پاس کے دیبات کے کتفے پھر لگا دلے اور شرمنی نے اپنے گاؤں میں کھاروں کا ایک ایک گھر جھان مارا، مگر قریب قریب سب کھارا بٹھیوں کے ساتھ بیٹھنے لئے میٹھے تھے جو فور آجوانی رشتہ طلب کرنے تھے اور ہادی اور شرمنی، میوس ہو کر اٹھاتے تھے۔ اگر کسی کے ہاں صرف اڑکی تھی قوودہ بارہ سو سینچے بات ہی نہیں کرتا تھا، اونہ یہاں کل اٹاٹہ ہی تین سو تھا۔

اس دوران میں یہ عصب بھی ہو گیا کہ ایک روز مراد نوری و ہمومن سے باشیں کرنا ہوا پکڑا گیا، نوری کے بھائیوں نے اس کا چھا کیا، اور اگر سب کھار مراد کی مدد کو نہ آئیختا تو دھوپی مراد کے گھر میں گھس کر اس کی دھچیاں اٹا دیتے۔ اس روز صوبیدار نے ہادی کو ہلاک کر کہا، کہ اگر آج کے بعد مراد نے کوئی ایسی حرکت کی تو اس سے جرا کوئی نہیں ہو گا۔ حاضرے اس پلے ہوتے ساندھکی نورا ہمیں شادی رکاوٹ یہ صوبیدار نے کہا۔ ”در نہ یہ قتل ہو گا یا جیل جائے گا۔“

دالپس آتے ہوئے ہادی نے اگرچہ اور اُدھر اُدھر دیکھا لیکن اسے محسوس ہوا کہ سب لوگ اسی کی طرف دیکھ رہے ہیں بلکہ بچوں کے انہوں دروازوں پر جمع ہیں، اور سورتیں اسے دیکھنے کے لئے چھپتوں سے لٹکی پڑ رہی ہیں۔ گھر میں داخل ہوا تو وہ ٹھنڈا بہت ہو رہا تھا۔ اس نے مراد سے کوئی بات نہ کی۔ شرمنی کے سامنے رو رو دیا۔ اور وہ اس کا ساتھ دیتی رہی۔ پھر دونوں انسو پونچ کر اٹھے اور اسٹھنے نادر کھاڑ کے ہاں چل دیئے، جس نے بیٹی کا رشتہ دینے سے انکار تو کیا تھا مگر یہ انکار اتنا سخت نہیں تھا کہ ہادی اور شرمنی کو اس کے پاس دوبارہ جانے کا حوصلہ نہ ہوتا۔ دونوں کی آنکھیں ہر خ اور سُوجی ہوتی تھیں اور گلیوں میں اگے پیچے یوں چپ چاپ سر جھکاتے چلے گے جا رہے تھے،

کو سارا گاؤں ان کا مقصد بھانپ گیا۔

جب میاں بیوی نادر کمار کے آنگن میں داخل ہوتے تو وہ چاک سے اٹھ کر چل پائی پڑھا سستا رہا تھا جاتے ہی شرفی نے اس کے پاؤں پکڑ لئے اور ہادی نے اپنی پکڑی اس کے قدموں پر ڈال دی اور پھر دونوں پیچو کر دنے اور آنسو پہنچنے لگے۔ نادر اپنے پاؤں پھٹرا کر اور پکڑی ہادی کے سر پر رکھ کر اٹھا، اور اندر سے ایک پیر حی لا کر شرفی کے پاس رکھ دی۔ ہادی کو اس نے چار پانی پر اپنے پاس بٹھایا، اور بولا۔ ”میں نے سب سُن بیا ہے۔ اب اس کا علاج یہی ہے کہ اس کی شادی کر دو۔ میں جانتا ہوں تم اسی لئے میرے پاس آئے۔ مگر بھیا! بات یہ ہے کہ مجھے بھی تو اس دُنیا میں زندہ رہنا پے، بھی اگر تم سارے پاس چل گئی تو میں اکیلے کیا کروں گا، کیسے جیوں گا۔ تم یوں کرو۔ کہیں سے کسی بیوہ کا انتظام کر دو۔ میں اسے اپنے گھر میں ڈالوں گا۔ تم میری بیٹی کو اپنے ہاں لے جانا۔ گندمی بات ہے پر سچی بات ہے۔ تم دونوں حصے کوئی انتظام کر دو گے تو میں بیٹی کا ہاتھ پکھوں گا اور تمہارے گھر پھٹوڑاً گاؤں گا۔ لڑکا بہنام ہے پر بنہ میاں تو درخت کے پتوں کی گردیں؛ ایک چینیٹا پڑا اور غائب پر پر دستگیر کی فتم لے لو۔ ہاتھ ملا لو؟“ اس نے ہاتھ پڑھایا اور ہادی نے آہستہ سے اس پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ وعدہ کر کے دونوں گھر دا پس آکر کوئی ٹھیکانے کے اندر چلے گئے، اور ایک اندر ہیرے گوشے میں جا کر ایک دسمبر سے پہٹ گئے۔ ”ڈھونڈ لیں گے“ شرفی بولی۔ ”ایسی بھی کیا بات ہے۔ کتنی ضرورت مند یچاریاں بیٹھی ہوں گی۔“

”آؤ ایک لفڑا لیں۔“ ہادی نے چار پانی پر بیٹھنے ہوئے گئے۔ اپنے گاؤں اور قریب کے دوسرے دیہات میں انہیں چار بیواؤں کے نام سوچھئے، دوسرے روز دونوں پہلے اپنے گاؤں اور پھر دوسرے دیہات میں سمجھئے

اور شام کو تھکے ہارے واپس آتے۔ لفکیوں والے تو صرف انکار ہی کرتے تھے بیواؤں کے وارثوں نے تو انہیں دعویٰ کا رد یا تھا۔ — اور مراد صحن کے ایک کونے میں چار پائی پر بیٹھا مسل حلہ پتے جا رہا تھا۔

دو تین روز تک ہادی اور شرفی ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور حیران ہوتے رہے۔ قیصرے روز ہادی کو ایک بیوہ کمارن یاد آئی، جو سات آنھوں کوں دوڑ کے ایک گاؤں میں رہتی تھی اور اس کا باپ ہادی کے لئے کچھ ایسا اجنبی تھا، شرفی سے مشورہ کر کے دو صحیح سوریے اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔

انہیں شام کو تھکا ماند، ٹوٹا ہارا، ہادی اپنے گاؤں میں داخل ہوا۔ وہ بیوی کی گلی کوٹے کر کے جب وہ دوسری گلی میں مڑا، تو پہلی طرف دیوار کے ساتھ چلتے ہوئے اسے دوسرے نظر آئے۔ وہ رُک گیا اور یون گھبرا گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا جسے سارا گاؤں چھتوں پر چڑھا آیا ہے اور اسے پیتے کی سی چکتی ہوئی آنکھوں سے گھور رہا ہے۔

اچانک نہ جانے اسے کیا سوچھی کہ وہ پکارا۔ ”مراد“  
مانے دیوار سے اچٹ آتے۔

”مگر چھوڑا وہ ہجنیا۔“

ایک سایہ گلی میں تیزی سے جانے لگا۔ ہادی نے اس کا سچھا کیا، اور جب دونوں اپنے گھر کے صحن میں داخل ہوتے تو ہادی نے مراد کو ہاتھ سے پکڑ کر کچھ عجیب سی، لگن لگن سی آوازیں کہا۔ اب آدم سے اپنے گھر میں بیٹھو۔ میں کل ہی تمہارا بندوبست کرنے دیتا ہوں۔“

شرفی تیر کی سی تیزی سے ہادی کے پاس لگی۔ یہ سو گیا کام؟ ”اس نے ہادی کا ہاتھ پکڑا کر پوچھا۔“ پاٹے۔ تم کیسے ٹھنڈے برت ہو رہے ہو۔“

ہادی خاموش رہا۔

”ہوتے کیوں نہیں؟“ شرفی نے ہادی کو ہاتھ سے جھینچوڑا۔ ”کیا ہوا؟“ وہ پکاری۔

”شرفی!“ وہ جیسے نیند میں ٹپٹایا۔

”ہاں کہو۔“ شرفی بولی۔

”شرفی!“ وہ پھر اسی طرح ٹپٹایا۔ ”میں تمیں طلاق دیتا ہوں۔“ پھر وہ پڑھتے

ہوتے ڈھول کی طرح ”رجا۔ طلاق۔ طلاق۔ طلاق۔“

ترٹاخ سے زمین پر گرتی ہوئی شرفی کے بے خبر وہ صحن سے باہر لپکا۔

نادر کے کوارٹ ایک دھماکے سے سُخلنے، اور ہادی نے دیوار کے سوراخ میں رکھتے

ہوتے دیتے کی روشنی میں نادر کو پہچان کر اسی کھوکھلی آواز میں کہا۔ تم نے پیر دشیر کی قسم کھائی تھی۔

”ہاں کھائی تھی؟“ نادر حیران ہو کر بولا۔

”تو لڑکی کو میرے گھر چھوڑا تو ہادی بولا۔“

قریب کی چارپائی پر لٹھی ہوئی لڑکی، شپ سے اندر بھاگ گئی۔

”کیوں؟“ نادر نے پوچھا۔ ”کام ہو گیا تھا وہ۔“

”ہاں ہو گیا؟“ ہادی بولا۔

”کہاں؟“ اُس نے پوچھا۔

اور ہادی ٹوٹے ہوئے برتن کی سی آواز میں بولا۔ ”میں ہیوی کو طلاق دے آیا ہوں۔“

---

## ہاتھم

امان پر کفن سا سخید بادل چھار بی تھا اور ہڈا میں کافر کی سی بو بھی ہوتی تھی۔  
میان جی کا جنازہ ابھی ابھی اٹھا تھا مگر جنازہ اٹھنے پر گھر دیں میں جو قیامت بپا  
ہو جاتی ہے اس سے میان جی کی چار دیواری مخدوم رہ گئی تھی۔ کھلے آنکھیں سے ایک  
سرے سے دوسرے سرے تک امور قیں ایک دسرے میں کچھ بیوں پیوست ہو کر  
بیٹھی تھیں کہ اگر ایک اٹھتی تو سب کی سب اٹھی ٹلی جائیں مگر سب شدید خدا ہک خاموش  
تھیں رخاموشی اور شہریدر خاموشی کے درمیان سکوت سے سنائے کا ناصد ہے اور موت  
والے اس گھر کے آنکھیں پر ہی سب سنا مسلط تھیا۔ پھر توں تک نے دم سادھ دیا تھا،  
منڈیر پر ڈیکھا ہوا کوئا بھی ہیسے لا دڑ پیکر پر کامیں کامیں کر رہا تھا۔

”تیر تیر تیر“ یکایک ایک عورت کوئے کی طرف باز داٹھا کر پکاری۔ کواؤڑ  
شکیا اور وہ مجھے سے مخاطب ہو کر بولی ۔ ہاتھم کے گھروں میں بھی ہڈیاں ڈھونڈنے آ  
نکلتے ہیں۔ موئے مکلو ہے زمانے بھر کے ۔ پھر ایک لمبی ”ہاہ“ کے ساتھ اسی نے  
اپنا بازو سمیٹ لیا۔

مجموعے کو شاید اسی بات کا انتظار تھا کہ کوئی بوئے تو ہم بھی بوئیں اس لئے سب  
لوئے گئیں اور رب نے جیسے ایک ساتھ پلے بدے۔

”ہا، بے چاری بی بی!“ کسی نے کہا۔

آنگن کے پرے گوشے سے ایک بڑھیا نے پوچھا: ”بی بی روشنی کہ نہیں؟“  
”نہیں!“ کوٹھے کے درد انے کے پاس سے جواب آیا: ”دیسے ہی بیٹھی ملکہ مردی کیجئے

جارہی ہے؟“

دری بڑھیا بولی: ”اسے رُلانے کی تدبیر کرو کم سختو، درنہ اس کا لیکھہ لٹھے کی طرح  
بھر سے پھٹ جاتے گا یہ سکتے گی بیماری ہے۔ پتہ بھی نہیں چلتا اور جان ہوا ہو جاتی  
ہے۔ فوراں اپنے بیٹے کے مرنے پر یوں ہی مرگی تھی۔“

سب کی نظریں بی بی پر جم گئیں جس نے اپنے میاں کے مرنے پر اب تک ایک  
آنسو بھی نہیں پُلکایا تھا۔ وہ ادھر ادھر دیکھ بھی لیتی تھی، ہوں ہاں سے باقتوں کا جواب  
بھی دے دیتی تھی مگر ردتی نہیں تھی۔

”رد بی بی، جی کھول کے رہ!“ پہلی طرف سے اوہ ہیڑ عمر کی بھاگاں اپنے آپ کو  
کھینچ کر اٹھی اور حورتوں کو والا گھنی اور بین کرتی ہوئی درد انے کی طرف یوں بڑھی جیسے  
بی بی کوڑلا کر ہی دم لے گی۔ علاقتے بھر میں اس سے بہتر بین کرنے والا کوئی نہیں  
تھا۔ انگشت شہادت کو آسمان کی طرف اٹھا کر، اسے ماتی دائزوں میں گھماتے ہوتے  
بولی۔

”تیرے نمر کے پھول کو آج موت کا بگولا اڑا لے گیا بی بی! ہن انیرے دنوں  
پر اب سورج کبھی نہیں چھکے گا، میری بڑی پی سیلی! اتنے ڈراوتے انہیں میں تو  
فرشتے بھی دیں بی بی! اور تو ہے کہ ایک یونھ بھی نہیں مارتا۔ میاں جی کا جنازہ اٹھ  
گیا تو اب اپنی میت پر ہی روئے!“

”میں مرجو گئی ہوں بھاگاں!“ بی بی نے آہت سے کہا اور میاں سے دہان تک  
حورتیں یوں کڑاک کر دیں کہ ان کی گودوں میں دیکے ہوئے پچھے بھی بللا اُٹھئے،

جن کے کافوں میں بی بی کی آواز نہ پہنچ سکی۔ وہ اپنے آس پاس سے روئے کی وجہ پوچھ کر رہ دیں جتنی کہ یہ مانگی لہر، آنگن کے پرے سرتے تک پھیل گئی۔ وہ پتھے جو بخازے کے پچھے نکل گئے تھے۔ اتم کمی گونج من کر جا گئے ہوئے آئے اور آنگن میں جھانکنے لگے۔ جو پتھے سنائے سے ہم کر ماڈی کے پاس ٹھنڈے ہوئے میٹھے تھے اُٹھے اور کوٹھے کے دروازے سے لگ کر بی بی کو گھوڑنے لگے۔

بی بی کا چہرہ فتن تھا۔ اس کی اسکھوں میں کچھ ایسا حالی پن تھا جیسے ان میں سے کوئی کچھ نکال کرے گیا ہے۔ اس سے ہر نٹ مٹی ہورہے تھے۔ اور اس کی کلآلی کے ایک زخم پر ایک مکھی بار بار آکر میٹھا جاتی تھی۔ جب حافظہ جی نے یکاک بند آواز سے کلد شہادت پڑھ کر میاں جی کے دم توڑنے کا اعلان کیا تھا تو کوئی تھنی کی دہنیز پر پڑھی ہوتی بی بی نے اپنی ناک کی کیل نوچ کر چینیک دی تھی اور جپن پھپن سے اپنی چوڑیاں توڑ ڈالی تھیں اور جب ادھر میاں جی کا طیا ٹھابندھ رہا تھا تو ادھر عورتیں سوتی کی مرد سے بی بی کی کلآلی میں سے کامیج کا ایک ڈسکرٹ انکال رہی تھیں۔

بی بی کو پہاں بر س کی غر میں بھی چوڑیاں پہنے کا شوق تھا۔ میاں جی کو ساٹھ بر س کی عمر میں بھی بی بی کی کلائیوں میں چوڑیاں دیکھنے کا شوق تھا۔ سفید کلآلی پر دیسے بھی ہر زنگ کی چوڑی بچ جاتی ہے مگر میاں جی تو چوڑیوں کے انتخاب میں فن کار تھے۔ ایسے ایسے رنگوں کی چوڑیاں ڈھونڈ دے ڈھونڈ کر لاتے تھے کہ آج تک وہ زنگ نہ کسی نے دیکھے تھے نہ سُنے تھے، ایک بار تو انہوں نے بی بی سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ جی چاہتا ہے تمہارے سارے جسم پر چوڑیاں چڑھا دوں۔

میاں جی کو قسم قسم کی پلٹیں جمع کرنے کا بھی ڈا شوق تھا۔ اسی لئے گول، چوڑ کوڑ تکونی اور کناروں والی پلٹیوں کا اشارا ان کے ہاں جمع ہو گیا تھا اور وہ پسیٹ تو انہیں بہت عزیز تھی جو وہ پونا سے لاتے تھے۔ ان دنوں وہ فوج میں جمداد کلرک تھے۔

کوئی چینی بھری دالا پلیٹیں بیٹھا پھرتا تھا۔ اس پلیٹ کے وسط میں بھرے جنم کی ایک چینی رنگ کی تصویر بختی جوانگور کی بیلوں کے حاشیے میں کھڑی مسکارہ بھی میلی جی کہتے تھے کہ جب انہوں نے یہ تصویر دکھی قوان کے سامنے بی بی کی صورت گھوم گئی۔ سو انہوں نے چینی کو منہ مانگے دام دے کر یہ پلیٹ خرید لی بختی اور جب چھٹی پر آئے تھے تو بکس میں سے یہ پلیٹ نکال کر بی بی سے کھاتھا۔ جس طرح کہانیوں کے جنہیں بھوتاں کی عبان طولی میں ہوتی ہے اس طرح اس جتن کی جان اس پلیٹ میں ہے اس لئے کہ پلیٹ میں قم ہے۔“

بی بی نے یہ پلیٹ برسوں تک اپنے کیلچے سے لگا کر بخی بختی۔ دم توڑنے سے ذرا پہلے میاں جی نے فرماٹش کی بختی کہ دوارا مسک اسی پلیٹ میں رکھ کر کھلاتی جاتے اب بھی وہ پلیٹ کو بھٹکے کے اندر ایک الماری پر رکھی بختی اور بی بی بار بار اس کی طرف یوں دیکھ لیتی بختی ہے ابھی بچوں کی طرح بُسک کر رہے گئے ہی مگر نہ جانے یہ کاہک عین مو قتے پر اسے رونا کیوں بخول گیا تھا۔

رونا اور اس کا ایک ہتھیار تھا۔ وہ تو میاں جی کی ایسی باتوں پر بھی رو دی بختی کے آج کے سالن میں کل والا مزا نہیں ہے، اور اُسے روتا دیکھ کر میاں جی کو صدق دل سے اعتراف کرنا پڑتا تھا کہ مغلوں کے شاہی باور چیزوں کو بھی اس مزے کا سالم تیار کرنے کا فتح معلوم نہ تھا۔ ان کی کوئی اولاد نہ تھی اس لئے دفون خود ہی کبھی کبھی بچے بن جاتے تھے، خوب خوب روٹھتے اور روئتے تھے۔

”قم مجھ سے دیسا پیار نہیں کرتیں جیسا میں کرتا ہوں۔“ میاں جی کہتے اور بی بی اپنی کنپٹیوں کی سفیدی کے باوجود مغل جاتی کہ میاں جی نے اس کے ایمان پر حملہ کیا ہے۔ اور آج میاں جی اس گھر میں سے ہمیشہ کے لئے اٹھو گئے تھے۔ اب وہ شام کی نماز پڑھ کر داپس آنے والے میاں جی کے قدموں کی چاپ کبھی نہیں مٹن سکے گی۔

اب کبھی یوں نہیں ہو گا کہ آدمی رات کو اس کی آنکھ کھلے تو اس کا سر میاں جی کے زانو پر رکھا ہو اور میاں جی اس کے ہنٹوں کے خطوط پر اپنی ایک انگلی کی پور پھر رہے ہوں۔ اب کچھ بھی تو نہیں ہو گا۔ لیکن یہ سب کچھ سوچ رہی تھی مگر اسے ان سرچوں پر بھی تو روزا نہیں آ رہا تھا۔

اگر اس کے آنسوؤں کا سوتا یک ایک خشک ہو گیا تھا تو جب بھی کم از کم دنیاداری کے لئے تو اس کا روٹا غردوی تھا۔ میاں جی کی دُور نزدیک کی رشتہ داریں بجاں بجاں ردتی ہوئی آئیں اور بی بی کو گلے سے لگا کر ایسے ایسے ہیں کئے کہ دشمنوں کے پیچے بھی پھیل جائیں مگر جب وہ بی بی سے الگ ہوئیں اور اس کی آنکھوں میں دھول اڑتی دکھی تو بعض حیرانی وہ گئیں، بعضوں نے لفڑت سے منہ پھر لیا اور بعضوں نے چکے سے دسری کے کان میں کدا ڈینا میں یہ پہلی بیوی ہے جو اپنے میاں کی موت پر خوش ہوئی ہے؟ پھر یہ سرگوشیاں صحن میں دُور نزدیک پھیل گئیں۔ بہاں سے دہاں تک ہوتی رونے کے بجائے ناکوں اور ٹھوڑیوں پر انگلیاں رکھ کر کھسر پھسر کرنے لگیں۔ دروازے سے الگ کر کھڑتے ہوئے پیچے بھی بی بی سے مایوس ہو کر اندر کو ٹھے میں کھینچنے لگے اور وہ اس بحوم میں اکیلی رہ گئی۔ روزناک کوشش سے نہیں آتا۔ یہ تو محنت کی طرح بڑی بے ساختہ چڑھتے۔ مگر بی بی رونے کی کوشش میں گلی ہوئی تھی۔ اس نے پیچھے تیس رسولوں کا ایک ایک داقعہ یاد کر ڈالا۔ کئی بار اس نے خسروں کیا کہ برسات کی رات ہے، چھت پر بوندیں نجح رہی ہیں، بادل کمیں دُور جیسے نیند میں گرج رہا ہے۔ کوئی ٹھٹھے میں میلی میلی روشنی والا دیا جائیں ہاں ہے۔ میاں جی کا سر اس کے بالوں میں ڈوب گیا ہے اور اس کے ہنٹوں کو میاں جی کے سینے کے بال چھوڑتے ہیں۔ ان بادریوں نے اسے جیسے دنوں کندھوں سے پکڑ کر چھلکا ڈالا مگر اس کی آنکھوں میں اسی طرح ریت کھلکھلتی رہی۔

کئی بار بی بی نے اس جگہ کو گھورا جماں میاں جی کی متیت جنازہ اٹھنے بک پڑی

رہی تھی۔ وہ ان پر چھاڑیں کھا کھا کر گئی تھی مگر لوگوں کے چھاڑوں کو نہیں دیکھتے آنسوؤں  
کو دیکھتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر تو بعض حیوان بھی چھاڑیں کھا کر گرفتار ہوتے ہیں۔ انسان کی  
پہچان تو آنسوہیں۔ انسان روئے نہیں تو کوئی کیسے مانے کہ اُس کا دل دکھا ہوا ہے۔  
آنکھ کے ایک ایک پچھے سے بی بی کی زندگی کے کتنے واقعہ پڑھتے ہوئے تھے۔  
ان دیواروں اور ان منڈیروں پر آج کتنی کہانیاں اُتر آئی تھیں۔ بی بی نے روئے کی خاطر  
ایک ایک چیز کو گھوڑا۔ اس کی نظریں منڈیروں، دیواروں اور دروازے پر سے گھومتی  
ہوئی کوئی کوئی کے اندر داخل ہو گئیں۔

یکاکیب وہ تڑپ کر لٹھی۔ دروازے کی طرف ایک قدم پڑھایا اور پھر ایک بلند جگہ  
کے ساتھ سینے پر نہایت زور کا دوہرہ مار کر دیں ڈھیر ہو گئی۔

بھاگاں اُنچھ کو اس کی طرف پکی اور پھر آنکھ کے پرے سترے تک تمام خورتیں  
اٹھی چھپی گئیں۔ — کہیا ہوا ہے کسی نے پوچھا اور پھر بھاگاں نے جیسے ایک مژدہ مناق  
ہوئے کہا۔ بی بی رو رہی ہے۔

چند عورتوں نے بھتی اور سکتی ہوئی بی بی کا بھیگا ہوا چہرہ اٹھا کر دوسرا خور توں  
کو دکھایا اور سب جیسے حیران ہو کر بولیں۔ ” یہ تو زار زار روز رہی ہے۔ یچاری۔ ”

پھر اندر کوئی میں کسی خورتے نے ایک بچے کے زور کا چاندا مارا اور اسے بازو  
سے گھیٹتی ہوئی دلیز پر آگر پکاری۔ ڈناروں نے بی بی کی پلیٹ سے مکڑے کر دیے ہیں۔ ”

---

# لکھنپا

ایک رات زور کی آنہ ہی اُتی تو سارے محلے کی بھلی اڑگی اور جب چند گھنٹوں کے بعد جلی تو جسب بھی ہماری بھلی کے نکڑ پر کھڑے ہوئے بھلی کے لکھنپے کے نصیب نہ جائے۔ اس کا بلب ہمیشہ کے لئے بھجو چکا تھا۔ بھلی کے بزرگ راجہ اصف علی نے ہمیشہ گوتی کی کہ اب کار پریشن کے آئندہ انتخابات تک یہ بھلی انہیں کے سپرد ہو چکی ہے۔ ہم نے اپنے اثر و رسوخ کا مظاہرہ کرتے ہوئے راجہ صاحب کو ملاع دی۔

”قبلہ! آپ آئندہ انتخابات کی حلقہ قائم کر دے یہیں اور اگر کل ہی نیا بلب لگ جائے تو یہ“

اور راجہ صاحب ہڑے اعتماد سے بو لے۔

دو کل قیامت آجائے گی؟ اس پر سب لوگوں نے فتنے لگاتے اور ایک دوسرے کے کندھوں پر باختہ مارنے کی کوشش میں انہیں کی وجہ سے ایک دوسرے کے منہ پر باختہ مار دیتے۔ مگر ہم نے دوسرے ہی روز سے نئے بلب کے لئے کوشش شروع کر دی اور ہماری یہ کوشش کوئی چوری نہیں تک جاری رہی۔ ہماری بھلی بدستور تاریک تھی مگر اب بھلی داںے اس تاریکی کے عادی ہو گئے تھے اور ایک روز راجہ اصف علی ہم سے کہہ رہے تھے۔

”اب تو آپ نئے بلب کی بعد وجہ کو ختم ہی کر دلتے کیونکہ اگر خدا نخواستہ کار پوریشن نے سچ مجھ بلب لگا دیا تو جتنے دن ہم نے اندر ہیرے سے ماؤس ہونے میں صرف کتے ہیں اتنے ہی روشنی سے ماؤس ہونے میں اٹھ جاتیں گے۔“ سمجھئے دیے اب ہماری گلی میں اندر ہیرے کی ایک طرح سے تلاشی ہو چکی ہے۔ سمجھئے کے ساتھ بلب تو خیر پڑانا ہی لٹک رہا ہے مگر اندر ہیرے کے ساتھ وہ جو ادا سی فلامٹی اور دیرانی شال ہوتی ہے اس کا ہماری گلی میں دُور دُور لٹک پتہ نہیں ماس کی وجہ ہے کہ ہماری گلی میں شیخ جی آگئے ہیں۔

بلب کے بچھنے کے بعد گلی والوں کا معمول ہو گیا تھا کہ اوھر شامِ ذرا سی گھری ہوتی اور اوھر سب اپنے اپنے گھروں میں دکپٹ کرتے گئے اور ایک گھروں میں ریڈیو ٹھنڈے تو وہ بھی گلگانتے یا سرگوشیاں کرتے رہتے جیسے آوازِ ذرا سی بلند ہوئی تو زلزلہ آجائے گا۔ سنا ما ایک ایسے کی طرح پندرہ بیس بھرے پرے گھروں پر مسلط ہو جاتا۔ دُور لٹک پر سے گھوٹی موڑ گزدی تو ایسا معلوم ہوتا جیسے کسی نے ہماری گلی کے اندر ہیرے کی ایک وحی پھاڑلی ہے۔ تائیج کے گھروں کی طرف میں ہماری گلی کے تالوٹ میں کیلئی چھوٹکی ہوتی چھوڑ جاتیں۔ اس دران میں اگر گلی میں سے کسی کے گزرنے کی آواز آتی تو اونھوں کھڑکیوں میں سے مبی مبی پرچھاتیاں آدمی آدمی باہر لٹک پڑتیں اور کوئی گھبرا کر پرچھاتیاں کون ہے؟“ معلوم ہوتا کوئی بھروسے اس گلی میں آنکھا ہے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ کسی کے گھر میں اچانک بچھنے ہونے لگا ہے اور کوئی دالی گو بلانے جا رہا ہے۔

شیخ بھی ہماری گلی میں شام کے بعد ہی آتے اس لئے بہت سے گھروں کی کھڑکیوں کے پڑ ایک ساتھ کھلے۔ پرچھاتیاں آدمی آدمی باہر لٹک پڑتیں اور راجہ آصف علی نے پرچھا ۔“ کون ہے؟“  
”آدمی ہے۔“ آواز آتی گرچھا ایسی جیسے کوئی لاوڑا اپنیکر فکا کر بولا ہے۔

اور کھڑکیوں میں لگئے ہوتے لوگ اندھیرے کے باوجود ایک دوسرے کی طرف یوں ریکھنے لگے جیسے سچ مجھ ایک دوسرے کی طرف دکھر رہے ہیں۔ کم سے کم میں نے تو چار کھڑکیاں پرے راجہ صاحب کی پھٹی بھٹی آنکھیں دکھلی تھیں۔

”آدمی تو ہے پر کون آدمی ہے؟“ راجہ آصف علی نے پھر پوچھا۔

جواب ملا۔ ”کہیں ہم اپنی کو تھڑیا کے دھوکے میں تھانے تو نہیں ہم سخن گئے ہیں۔ کہیں اپ ہماری ولدیت تو نہیں پوچھی جائے گی۔“

ایک منٹ کے بعد میں نے راجہ صاحب کے مکان کے اس ہنگامہ خیز گھنے کھلنے کے گھنے کی گنج سُنی جو گذشتہ کتنے برسوں سے صرف صحیح کی ناز کے وقت کھلتا تھا اور جس کی ٹھنڈھنی سُن کر لوگ اپنی کھڑکیاں درست کر لیتے تھے۔ میں نے راجہ صاحب کی لگک کو پہنچنا ضروری تھا اور جب یچھے پہنچا تو شیخ جی کہہ رہے تھے۔ ”پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے، کوئی بتلا دکہ ہم بتلائیں گیا۔ ارے بھی ہم کیا بتلائیں گے ہم کون ہیں۔“ کیا اس بھری دنیا میں کوئی بھی شخص اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بتا سکتا ہے کہ وہ کون ہے؟ کوئی مجھ سے اپنا تعارف کراہے تو دا اللہ اس کے لاتھ پر بیعت کروں۔ ارے آدمی کو قوی بھی معلوم نہ ہو سکا کہ سبزہ دلکش کیا سے آتے ہیں، اب کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟ اور شکنِ زلف عنبریں! بچھوچشم سرمہ سا! — آہا۔ تو صاحبوا جب کوئی بھی معلوم نہ کر سکا کہ بچھوچشم سرمہ سا کیا ہے تو وہ بے چارہ یہ کیسے بتائے گا کہ وہ کیا ہے اور کون ہے؟ ویسے میرا نام شیخ رفیع الدین ہے اور کام میرا اللہ کا نام لینا ہے اور اس کو تھڑیا میں جو تارہ پڑا ہے وہ میرا ہے۔ ایک آدمی نے محرقے کا تغوریہ لکھوا ای تھار تغوریہ لکھوں کر پسایا تو اللہ کی رحمت سے تند رست ہو گیا۔ بولا خدمت بتائیے۔ ہم نے کما سرچھپا نے کی کوئی جگہ دلو ایتے۔ بڑے بڑے بیکھوں

کے گیرا جوں میں رہتے رہنے والے رگوں میں خون کی بلگہ مولیں آئیں دوڑنے لگا ہے، تو اس نے اس کو ٹھہرایا کا انتظام کر دیا۔ ہم دن کو آج ہمارے پر آج ہمارے ایک مرید کے باپ کا چلم تھا، سو یہ بات ہے۔“

سو ہماری گلی میں شیخ جی کیا آتے چند ہفتے پہلے کی ساری آبادیاں بوٹ آئیں۔ شام کے بعد کچبے کا بلب قریب زخمی رہتا تھا میں شیخ جی چکا نہیں۔ گلی کے ہر گھر کا ایک نا ایک نمائندہ ان کی خدمت میں پہنچ جاتا۔ شیخ جی پار پائی کے سرہانے کی طرف اور راجہ آصف علی پائیتی کی طرف آتی پاتی اور کر بیٹھ جاتے اور اس پاس پوچھی بھل سمجھ جاتی۔ کوئی اپنے جوتے اتار کر انہی پر بیٹھ جاتا، کوئی پھٹا ہنڑا خبار بچھا لیتا۔ نوجوان درود دیوار سے لگے کھڑے رہتے، پھر ایک روز شیخ جی کیس سے دو چٹا میان اٹھا لاتے اور ان کی کوٹھریا اس گلی کی چوپال سی بن گئی۔ زیادہ وقت شیخ جی باتیں کرتے اور حاضرین صرف سوال پوچھنے پر اکتفا کرتے۔ آج تک نہ حاضرین کے سوالوں کے میں اور نہ شیخ جی کی باتیں نہ تم ہوتی ہیں۔ معلومات کا ایک دریا ہے جو کبھی تھنے میں نہیں آیا۔

”بابا!“ شیخ جی گر جدار آواز نکالتے۔ ٹھہر کیب فلافت کی کیا پوچھتے ہو میاں! ایک شعلہ جو اللہ تعالیٰ جو برماء سے بولان تک گھوم گیا تھا۔ اللہ اکبر! اللہ اکبر! یہ بڑے سے پچھے تکہ ہر شخص ترکی ٹوپی پہنے پھرتا تھا۔ خورتوں تک نے بر قبوں پر چاند تارے سجالتے تھے۔ ایمان تازہ ہو جاتے تھے یہ منتظر کیوں کر رہم فے ایک روز مولانا محمد علی کے کہا ”جو ہر بھیا اتم اشارہ کر دو تو اس وقت سری بھر سے اس کاری تکہ بغاوت کی آگ بھڑک سکتی ہے اور وہ انگریز جس نے ہمارے ٹمپوڈن اور سراج الدولاؤں اور بھادر شاہوں کو چبا لیا ہے بصدقت ت عازم انگلستان ہو سکتا ہے۔ قم اس وقت کے اسرافیل ہو۔ صور پھونک دو تو جتی وقیوم کی قسم قیامت آ جاتے؛ مگر مولانا بورے ”شیخ جی! بغاوت کرنے سے پہلے بغاوت کی نہیں دیکھ لیتی چاہئے۔“

کہیں یہ نہ ہو کہ ہم انگریز کے پیچھے پڑ جائیں اور بعض ہمارے ہی بھائی بند ہماری ہی ماڈ بہنوں کو اپکتے پھریں۔ ”سو میاں! ہم خلافتیوں کو یہی آبرد پر آنچ آجلنے کا خطرہ کھا گیا اور نہ آزادی آج سے تیس برس پہلے ہل چکی ہوتی اور ہم اس کو تھرا یا میں بند نہ پڑے ہوتے یہ پھر وہ اپنے شاگرد غاکی کو پکارتے ہیں اور ہمیں بھائی فاکی میاں! تم کہاں کھو گئے۔ آخر یہ کیا بد قیمتی ہے کہ جب تمہاری ضرورت نہیں ہوتی تو سر پر سوار رہتے ہو اور جب تمہاری ضرورت پڑ جاتے تو عنقا ہو جاتے ہو، ”محفل میں لفظی کی ایک رو دوڑ جاتی۔ اندھیرے میں بھائی فاکی کے کانے چہرے پر اس کے داشت جھملتا جاتے۔ وہ پھیس تیس برس کی عمر اور صوفیانہ دش قطع کے باوجود بچوں کی طرح سہوتا ہوا اٹھتا اور شیخ جی کی چارپائی کے پایے سے لگ کر بیٹھ جاتا اور شیخ جی کہتے۔ دمردا نوشہ کی دہ غزل سناؤ جو کتنے دنوں سے تیس ٹھارہ ہوں، مگر دمکھنا تلفظ کی غلطی نہ ہو۔ تلفظ کی غلطی ہو جاتے تو یوں مغلت ہے جیسے کسی نے شعر کے لکھنے میں چھڑا تماز دیا ہے۔“

فاکی سخنا تا ید قبلہ شیخ جی! وہ تو بڑی مشکل ہے تیرے تو سن کو صبا باندھتے ہیں، ”سُن لیجھتے“

شیخ جی کہتے یہ ٹھیک ہے۔ وہ بھی ٹھیک ہے۔ اس میں بھی مست کب بند قبا باندھتے ہیں، جیسے نثر ہیں، پر بھتی لوگو! ہم تو فاکی سے دہ غزل سنیں گے۔

ہے آرمیدگی میں نکرہش بجا مجھے

صبع دطن ہے خندة دندان نما مجھے

ظاہر ہے کہ لوگ بے جانے بوجھے شیخ جی کی تائید کر دیتے مگر فاکی بدستور سہوتا رہتا ”جی نہیں قبلہ بڑی مشکل ہے۔“

وہ مشکل ہے؟ ”شیخ جی گر جتے“ یہ شعر مشکل ہے؛ ڈھونڈے ہے اس

معنی آتش نفس کو جی، جس کی صدا ہو جلوہ برق فنا مجھے! اور کیا یہ شر مشکل ہے:  
کرتا ہے بکرے باغ میں تو بے چبابیاں۔ آنے لگی ہے لمحت کل سے جیا مجھے! —  
اور بھئی لوگو، تم کھیں کھیں کیا کر رہے ہو۔ ہائے شعروں کے انخاب نے رسوا کیا مجھے!  
— تو خیر، ہاں بھئی خاکی! بسم اللہ کرو۔

خاکی جھجک جھجک کر گانا۔ پھر آہستہ آہستہ کھلنے لگتا۔ پھر محفل پر دجد کی کیفیت  
طاری ہو جاتی۔ شیخ جی، ہر شعر اور شعر کے ہر ڈھنڈے پرواہ اور آہ کے نعرے لگاتے  
اور لگی دالے بھول جاتے کہ اس وقت اندر ہیری کھڑکیوں میں ان کی بھوئیں اور  
بیٹیاں جمیں اور وہ بتوں کی طرح کھڑی خاکی کی مُرمی آواز اور غالب کے رُس  
بھرے شعر سن رہی ہیں اور ان میں سے جو ذرا پڑھی تکھی ہیں وہ سوچ رہی ہیں کہ  
ماں میں بے عجائی کرنے اور لمحت لگل سے حیا آنے کے درمیان کون سار شستہ ہے۔  
شیخ جی جھوٹتے جھوٹتے چانک کر کر کتے۔

”کیا کہا بے چبابیاں؟“ پھر وہ خاکی کی خصختی بالوں والی کھوڑی پر تھپٹ مار دیتے  
”چحاب کی ح باکسر ہے۔ چھند کھیں کے۔ چھاب کی ح بھی باکسر ہے اور تقاب کی  
ن بھی۔ بالفتح پڑھو سکے تو یوں معلوم ہو گا جیسے بے چبابیاں کرنے والا مرد ہے۔  
زیر زبرگی اعطافتوں کو پچاونیتیزی کیس کے۔ سائیکلوں کی گھنیاں بناتے ہو بھی  
ذوق کی گھنی بھی سجادہ بان تو کمو۔ — ڈھونڈے ہے اس معنی آتش نفس  
کو جی۔“

ساری لگی میں شیخ جی کے لمحے تعلقات یا تو راجہ اصف علی سے تھے یا  
مجھ سے، راجہ صاحب سے اس لئے کہ ایک ہی دن کے بعد انہوں نے شیخ جی کے  
صحیح کے کھانے کا مستقل انتظام کر دیا تھا اور پھر راجہ صاحب کو بھی مومن اور حشرت موبانی  
کے وہ بیسوں اشعار یاد تھے جو محبوب کی آواز یا اس کے لباس کے توہنے سے

اس کے جسم کی رنگت سے متعلق ہو جاتے تھے۔ شیخ جی وضو کرتے ہوئے اپانک چلا تے ”راجہ صاحب!“ کھڑکی میں سے راجہ صاحب ”قبلہ“ کہ کر جھانکتے اور شیخ جی کہتے ”حضرت کا وہ شعر کیا ہے جس کا دوسرا مstrup ہے“ اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے بیاس کا۔“ راجہ صاحب کہتے ”رونق پر من ہوتی خوبی جسم نازمیں“ اور شیخ جی منہ پر پانی کا چھینٹا مار کر کہتے ”آہا، کہاں کی بات کہاں جا کر نکالی ہے ظالم نے۔ اسے کہتے ہیں شاعری۔ یہ حضرت تو خلافت کے زمانے میں بھی ایسے ترزاں تے شعر کرنے سے باز نہیں آتے تھے۔ آہا۔“

جھے سے ان کے تعلقات کی بیشاد میری چھوٹی سی لائبریری تھی جس سے شیخ جی روزانہ ایک کتاب کے حساب سے استفادہ کرتے رہے۔ پھر جب کتابوں کا ذخیرہ ختم ہوا تو رسالوں کی بارہی آئی اور جب رسالے بھی ختم ہو گئے تو روزانہ کا اخبار لے جاتے۔ جب وہ مولانا محمد علی، داکٹر انصاری اور حکیم الجمل خاں سے اپنے گھر سے روایط کا ذکر کرتے یا پھر جب وہ نواب بھوپال، نواب رام پور اور راجہ محمود آباد کے محلوں کی یوں باتیں کرتے جیسے اپنی کوٹھرٹماکی کیفیت بیان کر رہے ہیں یا جب وہ دلی کے انگریز سپر ٹنڈنٹ پوسیں کو چاند میں چوک کے بیچ میں ہڑاؤں کے سامنے ڈائٹ دینے کا قصہ سناتے تو میں چپ چاپ سنارہتا کیونکہ شیخ جی کے انداز گھنٹوں میں آور دکا بھی شبہ ہی نہیں ہوتا تھا۔ وہ یہ سب باتیں اس روایتی اور بے تخلفی سے کرتے جیسے سچ مجھ آپ ہیتی سنارہے ہیں مگر ایک روز جب انہوں نے ”لرزے ہے“ موج میں تری رفتار دیکھ کر ”پر آہا کا لغڑہ لگایا تو میں نے بھری مخمل میں کہہ ڈالا۔“

”شیخ جی! آخر یہ کیا بات ہے کہ آپ کو وہی شعر بھلے لگتے ہیں جن ہیں انسان کے جسمانی حسن کا ذکر آتے؟“ اس پر شیخ جی ایک لمحے کے لئے یوں خاموش ہوتے

کہ اس طرح پہلے سمجھی خاموش نہیں ہوتے تھے، پھر بڑی گنجیر آواز میں بولے  
”تمیں رفتار کے لفظ سے دھوکا ہتا ہے میاں۔“ تھیک ہے نا؟ پر دیکھو خفا  
نہ ہونا۔ تم شعر کو سمجھے نہیں ہو۔ موجے سے انسان کا دل مراد ہے اور رفتار  
سے شاعر نے پروردگار عالم کا کاروبار کائنات مراد لیا ہے اور اسی سے منتظر ہو کر  
کہا ہے کہ الال العالمین! الرزے ہے موجے کے تری رفتار دیکھ کر سمجھے؛ مکرم کیا  
سمجو گے۔ تمیں تو اس قسم کی شاعری پسند آتی ہو گی کہ تیغ کیا چیز ہے ہم تو پے  
لہجاتے تھے۔۔۔ بد نصیب ہو۔ ہمارے زمانے میں پیدا ہوتے تو پتہ چلتا کہ  
شعر کیا چیز ہوتی ہے۔ آج کل تو جو اٹھتا ہے دو شعر گھر کر فاک الشعرا بن جاتا ہے۔  
سنا ہے تم بھی شعر دع کرتے رہتے ہو۔ سنا د تو دو ایک شعر۔ دیکھیں تو سنئے پاں  
میں ہو۔“

شیخ جی کو میری ہات بڑی بگی ختنی مگر صرف اس حد تک کہ وہ اس گفتگو کے  
بعد ادا اس سے ہو گئے۔ مکمل خلافِ مکمل ہارہ بجھے سے پہلے ہی ختم ہو گئی اور  
اس روز کافی عرصے کے بعد گئی دالوں نے شکایت کی کہ کار پوریشن دالوں  
نے سمجھے کا بلب کیوں نہیں بدالا۔

دسرے روز ہماری گلی کی ایک رُنگی کی شادی تھی اور اس کے گھر نے۔

صحح سویرے سے پوری گلی پر قبضہ جانا مژروع کر رکھا تھا۔ ریڑھوں پر سے دیکھیں  
اُتر رہی تھیں۔ قناتیں لگکر رہی تھیں اور بار بار گلی کے سرے پر ٹالکے اگر رکتے  
رہتے جن میں سے بر قلع پوش خور تینیں زیور چھپھناتی اور ریشم سرماقی شادی والے  
گھر میں داخل ہو جاتیں۔ میں چاٹے پینے کے بعد دفتر حللا گیا۔ ہارہ بجھے کے قریب  
دھوت میں سڑک پر ہونے آیا تو تمام راستے ہند تھے برا تی قطار اندر قطار کھانا کھا  
رہے تھے یا سگریٹ پی رہے تھے اور شیخ جی کی کوئی ٹھڑی یا کا دروازہ نہیں دا تھا۔

میں نے کوٹھڑیا میں جھانک کا تو شیخ جی نے اپنا میلا کچیدا کمبیل پائنتی پر قریب  
قریب پیش دیا اور گرج گر بولے۔ ”کون ہے؟“  
پھر بھند دیکھ کر ان کے تیور سنبھلے اور بولے۔ ”آدمیاں! آجاؤ کھانا کھانے  
آتے ہو؟“

میں اندر پلا گیا۔ شیخ جی کی کوٹھڑیا کباڑخانہ بن رہی تھی۔ مٹی کے چھوٹے  
چھوسرے تھے رتن فرش پر بکھرے پڑے تھے اور ان پر گرد کی تہیں جنم پکی تھیں۔ کسی  
میں والی تھی تو کسی میں سوکھے ٹھکرے۔ مٹی کے ایک پایا لے میں چند کھجوریں پڑی تھیں  
جنہیں چیونٹیوں نے چھپلی کر ڈالا تھا۔ کھڑکی میں زرد زنگ کی، پڑاں کتابوں کا مذہبیہ  
اس طرح لگا رکھا تھا کہ اگر اس پر چڑیا بھی آکر بھیتی تو وہ زمین پر آ رہتا۔ چار پانی کے  
سر پانی کی طرف جو تکیہ رکھا تھا اس پر میں کا پلستر ہو چکا تھا اور شیخ جی اسی پر کھنی  
رکھے، پائنتی پر سے اپنا غلیظ کبل کھسکا کر میرے میٹھنے کی جگہ بنا رہے تھے۔  
میں بیٹھا تو اپانک فرش پر رتوں میں حرکت سی ہوتی۔ میں نے چونک کر  
ادھر دیکھا تو شیخ جی بولے۔ ”کچھ نہیں میاں! چوہے ہیں۔“ پھر وہ اٹھے۔ نیکے پاؤں  
چلتے ہوئے دروازے تک گئے لگلی میں دونوں طرف دیکھا اور دروازے کو بند کرنے  
نیک دا کر کے چار پانی پر آئیں۔ پھر بولے ”معاف کرنا میاں! ہم نے ذرا سختی سے  
پوچھ دیا تھا کہ کون ہے۔ آج صحیح سے کوئی دس آدمی ہمارے پاس ایک ایک کر کے  
آپکے ہیں کہ شیخ جی اپنے کھانا کھائیے! اور ہم نے سب سے ہاتھ جوڑ کر زخ است  
کی ہے کہ ہمیں میٹھے۔“ کل رات سے طبیعت کچھ بو جھل ہو رہی ہے شادی کا مرغی  
کھانا کھایا تو کہیں لیئے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ مگر وہ مانتے ہی نہیں۔ کہتے ہیں ضرور  
آئیے کھائیے نہیں تو آکر ذرا سا بیٹھ جائیے۔ ان بعد مذاقوں کو کون سمجھائے کہ ہماری  
ضرورت تو لوگوں کو چھپلوں اور عرسوں وغیرہ پر پڑتی ہے۔ ہم شادیوں کی دعوت میں

شریک ہوتے بھلے نہیں لگتے۔ تم ہی بتاؤ میاں! جس شخص نے خود شادی نہیں کی  
وہ دوسروں کی شادیوں میں کیا وچھپی لے گا؟“

”تو شیخ جی!“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”آپ نے شادی نہیں کی؟“  
”نہیں،“ وہ جیسے لاذدا پیکر پڑ گئے۔

”کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

ادردہ ہنس کر بولے: ”اگر ہم تم سے یہ پوچھیں کہ کیوں میاں! تم نے واڑھی  
کیوں نہیں رکھی تو تم سوائے اس کے کیا جواب دو سکے کہ بہن نہیں رکھی۔ سو ہم نے  
بھی نہیں کی شادی۔ مصروفیت زیادہ رہی، وقت نہیں نکال سکے۔ ہم تو ایک وقت  
میں ایک ہمام کرنے کے قابل ہیں سو ہم یا تو خلافت کی تحریک چلاتے یا شادی کرتے  
ہیں۔ خلافت خورت سے بھلی ٹھیک اس لئے شادی نہیں کی۔ تم نے شادی کی ہے؟“

”جی!“ میں نے کہا۔ ”میرے پنجھے بھی تو آپ نے دیکھے ہوں گے۔“

”ہاں ہاں!“ شیخ جی بولے ”ٹھیک ہے دیکھے ہیں۔ ماشا اللہ! ماشاللہ!“

گفتگو کا رجحان ذاتیات کی طرف ہو رہا تھا اس لئے میں خاموش ہو گیا۔ شیخ جی  
بھی خاموش بیٹھے واڑھی میں انگلیاں ڈالے ٹھوڑی کھجاتے رہے۔ پھر اپنا میلا تجھیہ  
میری عرف بڑھا کر بولے۔ ”یہ لو میاں! آرام سے بیٹھو۔ جو پارٹی کھانا کھا رہی  
ہے وہ اٹھ جائے تو چلے جائا۔“

میں نے تکیہ لے لیا اور شیخ جی سے رات کی گتناجی کی معافی مانگنے کے لئے  
مناسب الفاظ سوچنے لگا کہ اچانک شیخ جی بولے ”کیوں میاں! تم نے شادی تو  
کر لی پہ بھی عشق بھی کیا ہے؟“

میں نے حیرت سے شیخ جی کی طرف دیکھا۔ وہ مسکدار ہے تھے۔ اس وقت  
ان کی آنکھوں کا میل غائب ہو چکا تھا۔ میں نے سوال کی نزاکت کے پیش نظر

ویسی پھیر سے کام لینا چاہا ہے۔ سو پوچھا۔ دلکوں سا عشق شیخ جی ہے حقیقی یا مجازی ہے؟“  
شیخ جی طنز اپنے دھنیعی عشق قم کیا کر دے گے میاں! دُنیادار آدمی حقیقی  
عشق نہیں کر سکتا۔ قم سے ہم نے مجاز کی بات کی ہے۔“  
میں نے گھبرا کر کہا۔“ جی اکیا ہے۔ سب کرتے ہیں۔ کون ہے جس نے  
نہیں کیا؟“

اور شیخ جی بدلے۔ مثلاً ہم نے نہیں کیا۔ قم لے بوجوان ہاتھوں نے سمجھی  
کسی عورت کو بھوٹ سے بھی چھوڑا ہو۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر ہم جھوٹ بول رہے ہیں  
تو ابھی تمہارے سامنے ہماری انگلیوں کی پردوں میں سے کیڑے نکل پڑیں۔ میں  
بھیگ رہی تھیں تو اماں مر جوہہ ہماری ایک عالم زاد کا رشتہ ڈھونڈھو لائیں۔ ہمیں  
ناسان کے کہنے لگیں کہ اُنکی پانی پتی ہے تو گردن کی شفاف جلد میں سے پانی  
اڑتا ہوا دکھاتی دے جاتا ہے۔ بتانے لگیں کہ چپ پہ چپ پہ بھر لمبی۔ نکھیں ہیں اور  
ان پر چپ پہ بھر لمبی پکھیں ہیں۔ غرض انہوں نے تحد کر دی مگر ہم نے آب مر جو  
سے جا کر کہہ دیا کہ نہیں قبلہ! ابھی تو ہم داستان بوسستان ہی کو سمجھو نہیں پاتے  
ابھی تو ہمیں علم کے سختے مقامات طے کرنے ہیں، علم حاصل کریں تو بیوی بھی حاصل کر لیں  
گے پھر چند برس بعد خلافت کی تحریک شروع ہو گئی۔ اس دوران میں ابا مرحوم کو ایک  
اور رشتہ سوچا۔ مگر اس صیحت سے ہم یوں محفوظ رہ گئے کہ رشتے والوں کو ہماری  
درد لشی پسند نہ آئی۔ پھر درس و تدریس میں الجھے تو کجھی یہ نکال سوچا کہ عورت نام کی  
کوئی جنس اس دُنیا میں بستی بھی ہے۔“

شیخ جی یہ ہاتھ سوچا ایسی سنجیدگی سے کرتے رہے اور اس دوران میں ان کی  
مرنخ و سفید رنگت پر کچھا یہی نزدیک ہندی رہی کہ مجھے شیخ جی کی غلط بیانی کا یقین  
ہو گیا۔ میں نے سوچا جس شخص کے خطوط اتنے خوبصورت ہیں، جس کی آواز میں اتنی

جان ہے، جو علوم کا ذخیرہ ہے اور جسے حافظاً اور غائب رٹے پڑے ہیں اور پھر جو اس دنیا میں پچپن برس تک گھومتا رہا ہے جہاں کسی نہ کسی بھیر بھڑکے میں ایک اور بارہ مرد اور عورت کا کھوسے سے گھوا چکل ہی جاتا ہے وہاں شیخ جی نے کس میانار کا استغفار کئے رکھا ہے کہ اس کی چونٹ پر پچپن برس تک بیٹھے رہے اور اب تک بیٹھے ہیں، یہ ناممکن ہے۔“

میں نے شیخ جی سے کہہ دیا ”نمیں قلبم اینا ممکن ہے۔ میں نہیں مانتا۔ میں تو کہتا ہوں کہ آسمان سے کوئی فرشتہ بھی اترے تو شادی کے بغیر داپس ہونے کو اس کا جی نہیں چاہے گا۔“

شیخ جی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”تو کیا ہم جھوٹ بول رہے ہیں ہم تھیں ایک بار بتا جو دیا کہ ہم نے آج تک کسی عورت کو چھوڑا تک نہیں، سمجھے؟“ پھر فوڑا بولے ”جاڈ کھانا کھا لو۔“

میں نے اٹھ کر درد اڑہ کھولا تو خاکی اندر گیا اور شیخ جی کو لے یہ خاکی کو بھی ساتھ لیتے جاؤ میاں! جاؤ بھائی خاکی! خوب ٹھوںنے کے کھا لو۔ کل شام تک کی جھٹپتی کرو ہم نہیں کھا سکیں گے۔ ہمارے مزاج ٹھیک نہیں ہیں۔“ اور انہوں نے پاستی کی طرف سے تکید اٹھا کر سر ہانے کی طرف پھینکا اور کمبل تھیس کر لیٹ گئے۔

دوسرے دن سے شیخ جی کے ہاں پھر دی سختی مخفیں ہنئے گئیں۔ شیخ جی بڑے بڑے لیڈر دن کے ساتھ نکلتے سے پشاور اور بھیت سے سری نگر تک سے دو دن، جلسوں اور جلوسوں کے قapseُ ساتھے۔ خاکی سے غالب کی غریبیں سنتے اور رات کے بارہ بجے تک اندھیری گلی میں شعروں پر واو و مر جبار کے ڈونگرے بر ساتھ رہتے۔ دو دن بھر گلی کے بچوں کے ساتھ بچوں کی طرح کھیلتے۔ پھر کسی بچے کو تلگ دھرنگ گھر سے باہر نکلتا دیکھتے تو اس کی ماں یا بہن کو پکار کر کہتے ۔۔۔ اے بی بی! اس مختار

کو کہیں اکھاڑے میں آتا نے کے لئے تو نہیں بھیجا ہے یہ صاحب باہر بھی میں نجگے تشریف لے آئے ہیں؛ انہیں لے جاؤ یہ کوئی سودا یعنی دالا آتا اور اور کھڑکیوں میں سے لکھتی ہوئی عورتیں اس سے نرخ پر بچلگدیمیں تو شیخ جی فوراً گلی کی عورتوں کی حد کو پہنچتے۔ خاکی بھی اب دن بھر کو بھڑایا کے سامنے بیٹھا۔ اس نیکلوں کی گھنٹیاں بناتا بجا تارہ تک سانچہ ساختہ دہ آہستہ آہستہ غالبہ کی غزل میں گلگنا تما اور شیخ جی اس کا تلفظ درست کرتے رہتے۔

کوئی ایک ہمینہ یوں ہی معمول کے مطابق گزر گیا۔ ان دونوں راجہ آصف علی مخدوں میں بہت کم شرکیک ہوتے کیونکہ ان کی بیٹی کی شادی قریب تھی اور وہ ہر وقت اسی شادی کی تیاریوں میں لگتے رہتے تھے۔ پھر جس شام کو گلی والوں کو معلوم ہوا کہ کل راجہ صاحب کے ہاں برات آرہی ہے اور تمام گھروں سے کرسیوں اور دریوں وغیرہ کی ضرورت پڑے گی تو اس رات کو شیخ جی کے ہاں کی محفل سونی سی رہی۔ شیخ جی کے بھائے کسی اور نے خاکی سے کوئی غزل لگانے کو کہا۔ ذہ غالبہ کی ایک غزل لگانے لگا۔ یعنی - مُدت ہوتی ہے یار کو مہاں کئے ہوئے، قمرے شفر پر پہنچا تو شیخ جی نے اسے ایک غلطی پر اس روز سے داشا کم محفل سنائے میں آگئی۔ پہلے انہوں نے خاکی کو چند گاہیاں دیں پھر ہوئے یہ وضع اختیاط نہیں، وضع اختیاط۔ اختیافت ہے۔ پھر وہ وضع اختیاط سے رُکنے لگا ہے دم "ذراسی خاموشی کے بعد کہ پھر کڑکے مدکونا۔ بک رہے ہو تو بختے جاؤ۔"

خاک میٹیں کی طرح لگانے لگا:-

مانگے ہے پھر کسی کو لمب بام پر ہوس  
زلف سیاہ رُخ پر پیشان کئے ہوتے  
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو  
مرے سے تیزو شہہ مرگاں کئے ہوتے

اک نوبہارِ نماز کو تاکے سے پھر زنگاہ  
چہرہ فردِ نعم سے گلستان کئے ہوتے

اور حب خاکی آخری صحرع پر پہنچا تو شیخ جی نے اسے کچھ ایسی وحشت ناک آواز میں  
ڈانٹا کہ حاضرین دم بخود رہ گئے۔ کم سے کم مجھے احساس ہوا کہ خاکی نے ان اشعار  
میں تلفظ کی کوئی غلطی نہیں کی تھی اور شیخ جی نے بھی جسپ اسے ڈانٹا تو اس کی کسی  
غلطی کی طرف کوئی اشارہ نہ کیا۔ بس عجیب آواز میں کہتے رہے ہیں کہے جائے ہے،  
کہے جائے ہے۔ غول کا نام مار دیا تاں سین کے سالے نے۔ بس! اب آج کے  
بعد یہاں کوئی نہیں گلتے گا۔ اسی کو ٹھڑپا سے کسی کے گانے کی آواز نہیں آئے گی بس!“  
لوگ قبل از وقت اٹھ کھڑے ہوتے اور فاکی کو ٹھڑپا کے ایک کونے میں جا کر  
گھٹھری سابن کر لیت گیا۔

دوسرے روز میں ود پرکو دعوت میں شریک ہرنے آیا تو لوگی میں بلاکی روشن قہی۔  
سامنی گلی کو شامیانے سے ڈھانپ دیا گیا تھا اور براتیوں کی ایک لمبی تعداد ٹھیک کھانا  
کھا رہی تھی۔ راحم اصف علی نے دُور سے مجھے دیکھا تو پیک کر بدلے ہے بہت اچھا ہوا  
آپ وقت پر آگئے۔ بس آپ ہمارا آتنا کام کرو۔ مجھے کہ شیخ جی کو منا لایتے۔ وہ ہم سے  
خفا ہو گئے ہیں اور اب تک یہ نہیں بتایا کہ کیوں خفا ہیں۔ آج صبح کی نماز میں بھی شریک  
نہیں ہوئے۔ اندر کو ٹھڑپا میں لیٹے ہیں۔ کہتے ہیں طبیعت بوجمل ہے۔ بزرگ آدمی ہیں  
ان کا دعوت میں شریک ہوا ضروری ہے۔ ہم سب کو توڑا نہ دیا۔ اب آپ ہی تھت  
ازماں کیجئے۔

کو ٹھڑپا کا دروازہ بھپا ہوا تھا۔ میں نے اسے کھولا تو لیٹے ہوئے شیخ جی ٹرپ کر  
امتحنیجے اور گر جے ہے؟ کون ہے؟“

میں نے اپنا نام بتایا تو بولے: ”آجہاؤ میاں! آ تو کھانا کھانے آتے ہو؟“

میں جا رہا تھا پر چپ چاپ بیٹھ گیا تو وہ بولے۔ «صحیح سے راجہ صاحب نے  
جان ضیع کر رکھی ہے۔ کہتے ہیں دعوت میں ضرور شرکت کرو۔ اد بھتی، میں کیسے  
شرکت کروں۔ شادیوں کی دعوتوں میں شرکت مجھے کچھ بھلی نہیں لگتی۔ عرسوں، پنجموں  
کی دوسرا ہاتھ ہے۔ شادی پر خوشی ماننا تو یہاں ہر نزدیک بدل اخلاقی پر خوشی ماننا ہے۔  
راجہ صاحب کی اس لڑکی کو میں نے کھڑکی میں کھڑے ہوتے ہزار بار دیکھا ہے۔ ایسی بھولی  
بھالی، آسمان کی ہوڑسی لگتی تھی اور اب راجہ صاحب اسے نہ جانے کس لوٹے کے  
حوالے کئے دے رہے ہیں۔ یعنی یہ معلوم اب ایک غیر اُدھی کی بھولی میں بھیک کے  
ڈکڑے کی طرح ڈال دی گئی ہے اور اب یہ پچھے پیدا کرے گی اور ناس مار دے گی اپنا۔  
اس بات پر اگر راجہ صاحب خوشی مان رہے ہے ہیں تو مانیں، وہ منخار ہیں، پر ہم سے کیوں  
کہتے ہیں کہ آگر شرکت کرو۔ بھتی نہیں ماننا جی۔ نہیں آسکتے۔ قصہ ختم۔»

میں نے کھا بد شیع جی! آپ پسند کریں یا نہ کریں پر آپ کو شرکت کرنی چاہتے۔  
آپ بزرگ آدمی ہیں، نیکو کار نہیں۔ آپ کی شرکت سے برکت ہوگی۔»

اور اچانک شیع جی کے تیور عجیب غیر معمولی انداز میں ہدل گئے۔ انہوں نے میرا  
ہاتھ اپنے ٹھنڈے ہوئے ہاتھ میں لے لیا اور لپٹی اور بندھی ہوتی آواز میں بولے  
«تم کہتے ہو میں بزرگ ہوں، نیکو کار ہوں۔ تم مجھے اعتمدوں کی جنت میں لے  
جانا چاہتے ہو؟ نہیں میاں امیں نیکو کار نہیں ہوں۔ نیکو کار ایسے نہیں ہوتے۔ یہ اپنی کلی<sup>۱</sup>  
میں بھلی کے کھجے کا بلب دیکھتے ہو؟ اس میں وہ سب کچھ ہے جو اس کے دمرے بھایا ہے  
میں ہوتا ہے مگر اسے بلب کون کہے جائے یہ جلتا ہی نہیں۔ بلب وہی ہے جو حلے۔  
نیکو کار وہی ہے جو نیک کام کرے اور سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ آدمی اپنے خدا کی  
خالق کی خدمت کرے۔ پرمیاں! یہ بتاؤ کیا عورت خدا کی مخلوق نہیں؟»

میں خاموش رہا اور میرے ہاتھ پر شیع جی کے ہاتھ کی گرفت بہت سخت ہوئے

لگی۔ لرندتی آواز میں بولے ہے اور اس روز جو ہم تمہیں بتا رہے تھے کہ ہم نے زندگی بھر کسی عورت کو چھوٹا سماں نہیں تو ہم غلط نہیں کہہ دیتے تھے۔ ہم تو یہ سماں معلوم نہیں کہ عورت سے جسم کو چھوٹا جاتے تو کیسا لگتا ہے۔ تم ہمیں سیکو کار کہتے ہو حالانکہ ہم وہ بدنصیب ہیں کہ دنیا بھر کی عورتوں میں سے کسی ایک بیچاری کی بھی دلخوبی نہ کر سکے تو ایسی حالت میں ہم کس منہ سے کسی عورت کی شادی میں بشرطیک ہونے جائیں میاں؟ پھر وہ ایک دم ٹوٹ کر رو دیتے اور بھرا تی ہوتی آواز میں بولے ہے ”راجح صاحب سے کہہ دو کہ ہمیں معاف کر دیں۔ ہم اس قابل نہیں ہیں۔ ہم کسی قابل نہیں ہیں۔“

---

## دُور بیگن

ایک دن میں نے جبی کڑا کر کے اس سے پوچھی ہی لیا کہ — اگر یہی بات  
ہے تو لادا اس بحث کو کسی نتیجے تک جبی پہنچائیں یہ  
ہم اس وقت ایک ریستوران میں بیٹھے تھے جو بانے کے ایک گوشے میں پھنسا  
پھنسا اس جھٹپٹے میں کچھ ایسا لگتا تھا ہے اس کی میز س اور کرسیاں بھی پھونوں کی جھاڑیوں  
کی طرح زین سے اگ آئی ہیں اور جسیے جب خزان آتے گی تو اس کی منقصش چھت  
بھی پھونوں کی طرح کلک کر کر پڑے گی۔  
بحث کے نام سے روٹ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ویسے تو اس کی آنکھوں کا حصہ  
ہی یہی تھا کہ ان میں باہر ستارے سے دمک جاتے تھے مگر بحث کا ذکر آتے ہی جیسے  
یہ ستارے ایک جگہ رُک جاتے اور وہ میری طرف کچھ ایسی شرارت سے پُڑا اور نرس  
کے بھری ہوتی نظروں سے دیکھتا ہے کہ رہا ہے۔ اگر نکست کھانے کا ایسا ہی  
شوک ہے تو آتا ایک اور شکست کھالو۔  
”ہو جاتے“ اس نے میز پر کہنیاں رکھ کر، چہرے کو اپنے انخوں کے پیارے  
میں سجا لیا۔ ”نیصد مہینے تو ہتر ہے۔ چند دنوں میں امتحان کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔  
تو بھاری دو برس کی بحث اور حوری رہ جاتے گی۔“

اس وقت ریستوران میں راکاڈھا میز، ہی فالی تھی، لوگ یوں کڑک سکڑک کر باہم کر رہے تھے جسے سب جلدی جلدی سے کسی بحث کے نتیجے تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ ایک میز کے لوگوں کا دوسرا میز کے لوگوں کی باقیں سننا خارج از بحث تھا۔ کیونکہ سوراں قدر تھا کہ شاید ایک ہی میز کے لوگ بھی ایک دسرے کی باقی نہیں سمجھ رہے تھے۔

ہمارے درمیان جس بھی یہ بحث ہوتی رہت آہستہ آہستہ مشریعہ ہوتا گیا اور میں آہستہ آہستہ سمجھیدہ ہوتی گئی مگر آج تو میں بحث کی ابتداء کرنے سے پہلے یہ سمجھیدہ ہو رہی تھی اس لئے رہت بھی مجھے فراسا چونکا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی مسلسل حکمتی ہوتی انکھیں میرے چہرے پر یوں گاڑ رکھی تھیں جیسے وہ نظروں کے بجائے میرے چہرے کو انگلیوں سے چھوڑ رہے۔  
”سنوا ہمیں نے ہمت کر کے کہا۔ آج ہیر پھر کی باقی نہیں ہوں گی یہ تاؤ کہ کیا تم مجھ سے مجحت کرتے ہو؟“

”رہ مسکرا یا۔“ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی آگ سے پوچھے کہ کیا تم جلتی ہو؟“  
”یہ غلط ہے!“ میں نے اخراج کیا۔ میں نے بغیر محسوس بات کی ہے اور تم نہیں کی مثال دے رہے ہو۔ تمہاری حقیقت پسندی آگ کو محسوس کر لیتی ہے مگر مجحت کو کیوں محسوس نہیں کرتی؟“

”وہ بولا۔“ میں مجحت کو محسوس نہ کرتا تو تم سے مجحت ہی کیوں کرتا؟“  
”یعنی ثابت ہو کہ تم مجھ سے مجحت کرتے ہو!“ میں نے جیسے بحث کے ایجاد سے کی پہلی شش جیت لی تھی۔  
”ثابت کیا ہوا؟“ وہ کسی کو آگے کھسکا کر اور میز پر تقریباً سوار ہو کر بولا۔  
”یہ بات بھی کوئی ثابت کرنے کی ہے؟ ہم سیلی مجنوں تھوڑی ہیں؛ مجحت کر رہے ہیں،“

مجھتہ ہو رہی ہے۔ قصہ ختم ہے۔“

”جی نہیں ہے وہ یکاکیس سنجیدہ ہو گیا۔“ کھانے پینے کی مشال خلط ہے۔ کھانے پینے کے بغیر قوانین زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔“

” تو کیا مجھتہ کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے؟“ میں نے پوچھا اور اس کی طرف کچھ اس طرح دیکھا کہ اب کے قواں نے بھی اپنے چہرے پر میری انگلیاں عسوں کی ہوں گی۔ زندہ کچھ جھر اسالگیا۔ گرسی پر ہم لوہل کر اس لئے بیز پر پلے ایک کھنی میکی، چہرے اٹھایا اور دوسرا کھنی میک دی۔ اسے بھی اٹھا کر جیسے مر گوشی میں بولا یہ کہاں لے جانا چاہتی ہو مجھے؟“

”کسی نیچے تک!“ میں نے ناتحاذہ شان سے کہا۔

”دیکھو!“ اس نے ڈری ہتھاں سے بولنا شروع کیا۔ جو بحث تم شروع کرنا چاہتی ہے، اس کا نتیجہ صرف یہ ہے کہ مجھے قم سے مجھتہ ہے۔ تینیں بھی معلوم ہے کہ نتیجہ بس انسان سے گرتی ہیں تو اردو فارسی شاعر دن نے خراب کر کھا ہے جو محبوب کی خاطر سنندھ کو چھیرتے پہاروں کو تُرمہ بناتے اور اس کے باون میں ستاروں کی انسان چُختے ہیں۔ پچھے یہ نہیں جانتے کہ یہ ستارے تو ہماری زمین سے بھی بڑے بڑے گرتے ہیں۔ جلی ہمن چٹاؤں اور آسمی سالوں کے بیٹے، سیدھی طرح یہ نہیں کہیں گے مجھے قم سے مجھتہ ہے۔“

یہ نے کہا۔ بات یہ ہے دو فو کہیں تو اصل بحث ہے۔ مجھتہ جس ب ایک سکھ سائنسدان کے دل پر بھی دستک دیتی ہے قواں کے لئے ستارے جگنوں جاتے ہیں۔ مجھتہ اسے تلا تا ہوا بچہ بنادیتی ہے جو چاند کی صرف ہمکتا ہے اور ستاروں کے لئے ضد کرتا ہے۔ مجھتہ اس کی آنکھوں پر سے دور ہیں اتار لیتی ہے اور وہ سیدھے سماں اور پچھے انسان کی طرح ستاروں کو یوں دیکھتا ہے جیسے وہ زمین پر سے نظر آتے ہیں۔ آنکھ کوئی بڑے سے بڑا سائنس دان بھی چاند میں چرخہ کاتتی ہوئی بڑھیا کے بینے

میں اپنے علم کا خیز نہیں اتار سکتا تم نہ رڑھنڈ و را پٹتے پھر دکر چاند تو غاروں سے پٹاہوا  
ہے اور اگر انسان کو زمین پر سے اٹھا کر چاند میں اتار دیا جاتے تو وہ پھر کر مر جاتے  
مگر کیا تم اس طرح انسانوں کو چاند سے نفرت کرنا سکھا سکو گے؟ وہ تو تمہاری دُودھ میزوں  
اور تمہارے راکھوں کے باوجود چاند کو اس کی چاندنی ہی سے پچایں سکے۔ یہ جو چاندنی  
چاندنی اور چاند کے غاروں کے درمیان ذرا سلفرق ہے ناؤ اسی کا نام انسان ہے اور  
یہی شاعری ہے:

”بہت اچھا!“ روٹ نے میری دلیل کو اپنی شرارت سے کاٹنا چاہا ہا۔ میں نے

دُور بین الگ رکھ دی ہے اب بلو۔“

مگر میں تو آج یہ تہی کر کے آئی تھی کہ فیصلہ کر کے ہی اٹھوں گی۔ عنقریب سالانہ  
امتحان شروع ہو رہے تھے۔ پھر ہمیں ادھر ادھر بھر جانا تھا، اور میں سوچ تک نہیں  
سکتی تھی کہ میں اس کے بعد روٹ کو غیر بھر نہیں دکھو سکوں گی یا اگر زندگی کی مسافت میں  
کسی دوڑا ہے پر ہماری ٹیکھی ٹیکھی تصورت آشناوں کی طرح ہم ایک دوسرے پر  
”ہیلو“ کی سکریاں اچھائ کر آگے بڑھ جائیں گے۔ میں تو دن بھر کی ہاتوں اندھوں کے  
بعد بھی جب روٹ سے الگ ہوتی تھی اور یہ سوچتی تھی کہ اب ہم کل کامیح ہی میں مل  
سکیں گے تو ایک لمحے کے لئے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہاںکے بر فواری ہونے  
لگی ہے اور میں اپنے اندر سکڑی جا رہی ہوں۔ ہاتوں کو میں کتنی کتنی دیر کہ دن بھر کے  
واقعات کو کتنی کتنی بارا پہنچنے دہن میں دہراتی اور جب سچ کو اٹھتی تو کامیح جانے سے  
گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ پہنچے ہی تیار ہو جاتی تھی۔ یوں مجھے ہر سچ کو ایک صدی گزار نما پہنچاتی  
تھی، مگر جب میں روٹ سے پوچھتی تھی کہ اس کا وقت کیسا کیا تو وہ مجھے بتا تاکہ ”خوب  
لیے گئے رہے“، یا ہمیں نے فلاں کی فلاں کتاب پوری کی پوری رٹ ڈالی یا دوستوں  
میں پھنس نگئے اور پچھے بچے سے بارہ بچے تک اسکھی دو نلمیں دکھو ڈالیں۔ یہی باقیں

تھیں جن پر میں کہتی بار غبیر کرنے کے ہادیود رو دی اور پھر محنت کے نسلخ پر ڈٹ ڈٹ کر  
جھیش کیں۔ اسے یہ دعویٰ بھی تھا کہ وہ مجھ سے محنت کرتا ہے مگر ساتھ ہی وہ یہ بھی کہ دیتا کہ  
تماری طرح مجھے صبح کا انتظار اس لئے نہیں ہوتا کہ مجھے ایک بہت بڑی حقیقت کا یقین  
ہوتا ہے اور وہ حقیقت یہ ہے کہ جب شام ہرتی ہے تو صبح ہونے میں صرف دس بار  
لگھنے باقی ہوتے ہیں۔

میں نے رُوف کے ساتے ہمیشہ تسلیم کیا کہ میں محنت کرنے والی ایک رُکی کے  
علاوہ ایک طالب علم بھی تھی۔ اپنے ماں باپ کی بیٹی بھی تھی۔ اپنے وطن کی شہری  
اور انسانی برادری کی ایک لگن بھی تھی مگر میری ان تمام جیشتوں پر رُوف یوں چھایا  
ہوا تھا جیسے درخت کے تنے پر شاخیں چھاتی رہتی ہیں۔ میں اپنی ہر جیشیت میں  
رُوف کے ساتھ داشتگی کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور نکال لیتی تھی۔ انسانی برادری سے  
پیار کی بات آتی تو رُوف مجھے اس بزم کا صدر نشین نظر آتا۔ رُوف جیسے فرزند وطن کی  
رعایت سے مجھے سارا وطن جیسی معلوم ہوتا تھا۔ میں اپنے ماں باپ کی کتنی لمنون  
تھی کہ انہوں نے اپنی محدود آمدی کے باوجود میری تربیت کچھ اس انداز سے کی تھی  
کہ مجھے جیسی عام سی صورت کی ایک رُکی رُوف تک کی نظرؤں میں جچ گئی تھی حالانکہ  
رُوف جس سوسائٹی کام کن تھا اور جس سوسائٹی میں گھومتا تھا وہاں ایسی ایسی رُکیاں  
پائی جاتی تھیں کہ کوئی آنکھ بھر کر دیکھتے تو اس کی نہیں پہنچ جاتیں۔ میری میری طالب علمی  
تو ممکن ہے قدرت میری طالب علمی کے رُوف میں دراصل میری شخصیت کی سکھیں  
کرنا چاہتی ہو۔

میں جانتی تھی کہ رُوف مجھ سے محنت کرتا ہے مگر ساتھ ہی مجھے یہ بھی  
معلوم تھا کہ اسے اپنی کتابوں اور اپنے پروفیسر دن سے اپنے دستوں اور ان  
کے لطیفوں سے بھی محنت سہتے۔ ایک بار اس نے کالج لان کی ایک بیچ کی طرف

اشارہ کرتے ہوتے کہا تھا۔ "اس نجی پر بیٹھ کر میں نے ملٹن اور گوئٹے کو پڑھ لئے  
اور اسی پر بیٹھ کر میں نے عجیب عجیب دیوالوں کے سے خواب دیکھے ہیں۔ ایسا لگتا  
ہے جیسے میری آدمی رُوح اس نجی میں اُتر گئی ہے۔ جی چاہتا ہے امتحانِ نختم  
ہوں تو ایک رات پچکے سے آؤں اور اسے اکھاڑ کر لے جاؤں ۔ اور میرا کیسا کیسا  
جی چاہا تھا کہ میں ایک رات پچکے سے کھڑاڑی لے کر آؤں اور اس نجی کی نکڑی  
کو چھپ رکھا جو کروال دوں۔"

اس روز بھی اُس نے کہا "وہ بھی سنو تو، جب میں بے جان نکڑی کے چند ٹکڑوں  
سے، جنہیں نجی کہتے ہیں، اتنا پیار کر سکتا ہوں تو آخر تم تو انسان ہو، اور تم تو بڑی  
پیاری انسان ہو۔ میں تمہارے اس شہسے کو کیسے دُور کر دیں کہ مجھے تم سے محبت نہیں  
ہے۔ آخر یہ میری جماعت کے نصاب میں تو نہیں کھاہے کہ میں سوائے متاب  
کے کسی لوگ کی طرف نہ دیکھوں۔"

محبت کو ٹھکانے لگتا دیکھ کر میں نے کہا "وہ روفو اسنے، بات یہ ہے کہ یہ

سب ٹھیک ہے، مگر سنو، سُن رہے ہو تا؟"

"ہاں ہاں" اُس نے کُرسی کو میز کے بالکل ساتھ لگایا چاہا، مگر وہ پہلے ہی  
میز کے ساتھ جزوی ہوتی بھتی۔

"سنو" میں نے کہا۔ "وہ دُگ میری سمجھ میں کبھی نہیں آتے، جن کی دو شخصیتیں  
ہوتی ہیں، اور روفو اتم ایک نہیں دو ہو۔ ایک وہ جو میرے سامنے بیٹھے ہو اور  
دوسرے وہ جو یہاں سے اٹھنے کے بعد ہو جاؤ گے"

"اور تم کتنی ہو؟" اس نے بڑی سہیگی سے پوچھا۔

"میں؟" میں نے کہا "میری شخصیت صرف ایک ہے، یہ جو تمہارے سامنے  
ہے۔"

”بہت اچھا!“ اس نے اپنے آدھے دھڑکو نیز پر تقریباً پھیلایا اور میرے بالکل قریب ہو کر بولا ”اگر تم سے تماری کوئی ہم جماعت پوچھے کہ ان دونوں قم روٹ کے ساتھی تھت کر رہی ہو تو کیا انہاں بختے ہوئے تماری ایک اور شخصیت پیدا نہیں ہو جائے گی؟ یا جب تم قیل ہو جاؤ گی اور تمکے آبا اس کی وجہ پوچھیں گے اور تم انہیں یہ بتانے کی بجائے کم محبت میں مصروف رہیں، یہ بتاؤ گی کہ امتحان کے دونوں میں بیکا ایک تمیں بخارنے آیا تھا، تو کیا یہ تماری وہی شخصیت بول رہی ہوگی جو اس وقت میرے سامنے ہے؟“

میرے فیض چہرے اور ڈبڈ بانی آنکھوں سے رعب کھائے بغیر وہ بوقاچلا گیا یہ میں یہ نہیں کہتا کہ انسان ہمیشہ دو یا اس سے زیادہ شخصیتوں میں ٹھاکرے گا۔ نکن ہے جب اس کے سامنے سے غیر ضروری پابندیاں ہست جائیں تو اُسے اپنی شخصیت سے ٹھوڑے کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہو۔ مگر تابی! اس زمانے میں، جس میں ہم زندہ ہیں اور جس سے باہر نکل کر ہم زندہ نہیں رہ سکتے، ذرا سی ریا کاری بڑی چیز ہے۔ یہ نہ ہو تو دن میں ہر آدمی کے سو جھوٹ پڑھے جائیں۔ ”و تو کیا میں جھوٹی ہوں؟“ میں نے سمجھتے میں کسی ربط کی پرواکتے بغیر پیغام کر کھاند کے ہونے آنسو، یا کا ایک عیری آنکھوں میں سے اُبی پڑھے اور قریب کی میزوں پر بیٹھے ہوتے لوگوں نے میری طرف کچھ اس شوق سے دیکھا، جیسے تھیں ڈال میں لگنے والے بھر کے انتظار کے بعد آخر کار اسٹیچ پر سے پڑھا۔

روٹ فوراً اٹھا۔ قریب سے گزرتے ہوئے ایک بیرے کو بازو سے پکڑ کر اس کے ہاتھ پر دس روپے کا ایک نوٹ رکھ دیا، اور بھر تھجے کھانی سے پکڑ کر، ریستوران میں سے نکال لے گیا۔ میں نہیں جانتی حتیٰ کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ وہ اس دوران میں کچھ نہیں بولا۔ بس اُس کی گرفت آہستہ آہستہ ڈھینی پڑھتی گئی۔ پھر اُس

کا ہاتھ میری ٹکلائی سے کھسک کر نیڑے ہاتھ میں آگیا اور اس نے میری انگلیوں ہی پانی انگلیاں پیوست کر دیں۔

پھر جب وہ ایک لگنے کنج میں پہنچا تو اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے میرا چہرہ تھام کر، میری طرف یوں دیکھا، جیسے ایک سمجھی سی پیکی کوڈ میں پرستے اٹھا کر دیکھ رہا ہے کہ کہیں مُسے چوٹ قو نہیں آئی۔

”بُرَا نہ ماؤ تو تم سے ایک بات پوچھوں: اُس نے آہستہ سے کہا۔

”میں ناموش رہی۔ کیونکہ میرے خیال میں وہ بُجھُ سے یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا بھرے جمع میں یوں چیخ کر بولنا اور رو دینا ہی محبت کی نشانی ہے۔

اس نے میرے جواب کا انتظار کرنے بغیر پوچھا۔ ”جانتی ہو آج کی بحث میں کون

جیتا ہے؟“

اب کے بھی اُس نے سوال کے جواب کا انتظار نہیں کیا اور بولا۔ ”تم جیتیں؟“

”میں جیتی ہو،“ میں نے پوچھا ہے میں کیسے جیتی جیتیے تم اور تمہاری مسطق اور تمہارا

ہزار شناختی فلسفہ۔“

”منہیں جیتیں،“ اُس نے مجھے وقار سے لپٹاتے ہوئے کہا۔ ”یہ جو محبت کا قصہ ہے نا، اس میں ہمیشہ عورت ہی حصتی ہے۔ زندگی کا یہی تو ایک پہلو ہے جس میں صفتِ قوی کو صفتِ لطیف کی قوت کا انتہا گھٹتے ہیک کر کرنا پڑتا ہے۔

سو میں ہارا۔“

اور میں نے جیسے ایک بلند پہاڑ کی چوٹ پر سے نیچے دیکھ کر پوچھا۔ ”اگر تم ہائے تو ماڈ کہ تمہارے ساتھ تمہارا فلسفہ بھی ہارا۔“

”بحث نہ چھپڑو،“ وہ بولا۔ ”ایک بار کہہ جو دیا کہ میں ہارا۔“

”اچھا تو پھر وعدہ کرو،“ میں نے کہا۔ — اور میں نے وہ سب کچھ کہہ دیا،

جس کے بارے میں پچھلے دو بوس سے میں قریب قریب ہرات نئے سرے  
سے سوچتی تھی۔

”ٹھیک ہے، اس بٹھیک ہے،“ اس نے کہا۔ ”یہی ہونا چاہیئے“  
”ہونا چاہیئے نہیں، یہی ہو گا۔“ میں نے ضد کی۔

اور اس نے مجھے ایک بار چھپ لپٹایا۔

اس دوران میں روف کے کئی خط آئے مگر یہ آخری خط جس طبقہ میں نہ  
مکان کی بچھت پر جا کر اسے کھولنا کھاتا تھا۔  
تابی۔۔۔ میری دوست!

امنی اور آیا، دونوں سے ایک بار نہیں، کمی با رکھہ دیکھا ہے لیکن وہ نہیں  
ماتتے کہتے ہیں منتاب پڑھی لکھی ہی مگر اس کے آبانے چھوٹے سے غیاری کی حیثیت  
ہی سے تو کار و بار شروع کیا تھا اور لوگ کیسی سے کہ رانا عزفان الہی کے انکوتے بیٹھے  
نے ایک غیاراں کو گھر میں ڈال دیا ہے، مجھے اس کا بڑا ہی دکھ ہے۔ مگر یہ زمانہ  
جس میں ہم زندہ ہیں اور جس سے باہر فکل کر ہم زندہ نہیں رہ سکتے، ہمیں اس سے  
زیادہ بچھ نہیں دے سکتا۔ اب سواتے اس کے اور کوئی راستہ نہیں کہ ہم میاں ہیوی  
نہیں بن سکے تو بھی دوست ضرور ہیں۔ موج ساحل پر ڈک نہیں سکتی۔ لیکن اپنے  
وجود کے ایک حصے کو کاٹ کر ریت میں ضرور جذب کر جاتی ہے۔ بھیگی ہوئی  
ریت، موج و ساحل کی دوستی کی نشانی ہے۔ تم اگر عام رکھیوں کی طرح رونے  
نہ بیٹھ جاؤ اور میری تجویز پر مٹھنے دل سے ذرا ساغر کرو تو تم اُداس نہیں  
ہو گی۔ مجھے تمہارے جواب کا انتظار رہے گا۔

تمہارا دوست      روف

خط پڑھنے کے فوراً بعد مجھے خدمتی کر لینے کا خیال آیا۔ اس کے ساتھی اچانک مجھے اتنی یاد آگئیں، جن کے موٹے شیشوں والی عینک کے تیچھے ان کی آنکھیں اور بھی جھوٹی ہو گئی تھیں اور وہ میری طرف یوں دیکھ رہی تھیں، جیسے مجھے نہیں دیکھ رہیں۔ جیسے میں وہاں ہوں ہی نہیں، جیسے میری اتنی کی نظر وہ کے سامنے سے آسان بھی ہٹ گیا ہے اور وہ اتنے غلظیم خلاہ کے کنارے پر کھڑی دُول رہی ہیں، کہ اگر میں نے چیخ نہ ماری تو وہ اس خلاہ میں کوڈ پڑیں گی۔

پھر آبا حسب عادت مسکرا تھے ہوتے اپنی بھڑکی سے، فرش اور دروازے اور صوفی اور امیگ کو بجا تھے ہوتے آتے اور میری طرف دیکھتے ہی ان کے ہزوں ٹوں کی مسکراہٹ ان کے ہاتھ کی بھڑکی کی طرح فرش پر گر پڑی۔ بھراں کی آنکھیں جیسے گھنل کر پانی بن گئیں اور وہ ہنوا کو ٹھوٹتھوٹتے ہوتے دروازے کی طرف یوں کانپتے ہوتے جانے لگئے، جیسے ساری دنیا کو اپنی مدد کے لئے پکارنے چلے ہیں۔

پھر میں نے اپنے آپ کو دیکھا۔ میں اپنے کمرے سے گلگنگا تی ہوتی لکھی اور اپنی طرف دیکھتے ہی ٹھنک کی اور میں نے دیکھا کہ میری انگلیوں کی پوروں پر خون کی بوئیں جمع ہیں۔ خون کا ایک بڑا ساقطہ میری تھوڑی پر لرز رہا ہے۔ میرے کافنوں کی لوتوں میں خون کے قطرے، مرخ آویزوں کی طرح جمجمہ جما رہے ہیں۔ جہاں میں کھڑی ہوں وہاں خون کی ایک نتھی سی قیابن رہی ہے اور میرا باس میرے جسم سے چیپکا پڑ رہا ہے۔

میں اپنے اس خون آبود وجود سے، ڈر کر بھاگ کھڑی ہوتی، اور جب میں ہانپتی ہوتی اپنے ہوش میں آئی، تو میں نے دیکھا کہ میں اپنے کمرے میں کوئی پڑھنی میر پر سر رکھتے آنکھیں بند کرتے پڑی ہوں اور روڑ کا خط میری نتھی میں ہے اور ساتھ دالے کمرے میں لڑکیاں اور فیلیا بخنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ مگر انہیں ڈھب کا کوئی «ہیئت» نہیں مل رہا ہے۔ «چلو متاب کو آزادتے ہیں؟» ایک آواز آتی ہے۔

اور میں چونگاٹھتی ہوں، اور دہان سے بھاگ آتی ہوں۔  
 میں بھاگتی بھاگتی اپنے سکان کی آخری سیڑھی تک پہنچ گئی۔ جہاں امی اور ابا  
 جیسے میرے انتظار میں کھڑے تھے، انہوں نے مجھے لپک لیا، تب میں نے  
 محسوس کیا کہ میں مر جاؤں گی۔  
 اور میں ابھی تک مر رہی ہوں۔

---

## شیکھیں

میں نے اتنا مکمل اور بے دانع بس بہت کم آدمیوں کا دیکھا ہے۔ چند لمبے بیٹھنے سے اچھے سوٹ میں بھی کہیں نہ کہیں ایک آڈھٹکن ضرور پہیا ہو جاتی ہے۔ مگر غفور کے بس میں کوئی شیکن ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی لختی۔ بظاہر لوگ معلوم ہوتا تھا بھیسے دہ اس ڈر کے مارے ہمیشہ چلتا رہتا ہے کہ کہیں بیٹھنا نہ پڑ جائے یا جس طرح بعض عوادتوں کے پاس اپ اسکے ہر وقت موجود رہتی ہے تاکہ حسب ضرورت ہونٹوں میں آب پیدا کی جاتی رہے اسی طرح غفور کے پاس کوئی جیسی استری ہے کہ ادھر پہنون پر ایک آڈھٹکن نوادر ہوتی، ادھر عاستب کر دی گئی۔ بڑے بڑے پارچے فروشوں اور درزیوں کی دکانوں کے باہر آپ نے بے شیکن سوٹوں میں ملبوس ڈمیاں تو دیکھی ہوں گی۔ غفور کو بھی ایک ڈمنی ہی سمجھو لیجئے۔ مگر صرف بس کی حد تک اور یہ تو وہ بڑا جیتا جاگتا انسان تھا۔

پہلی بار جب غفور سے میرا تعارف کرا یا کیا تو وہ بیدا بیکنٹ تھا۔ اس لئے مجھے اس کی خوش بہاسی پر کوئی تعجب نہ ہوا۔ جس محفل میں اس سے ملاقات ہوئی، وہاں بڑے پاتے کے فن کار اور فن دوست لوگ جمع تھے اور کسی بیدا بیکنٹ کا بیکنٹ کی جیشیت سے، اس محفل میں شرکیک ہونا خارج از بیکنٹ تھا۔ پھر فن میں رجعت

اور ترقی، مردی اور زندگی کی جو بخشیں ہیں، ان میں غفور نے صرف بڑھا پڑھ کر  
ہی جسم نہیں لیا کہ یہ کام تو بعض جملہ بھی خاصے سیقے سے کر لیتے ہیں، اس کی  
باتوں میں وزن بھی تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ فن کی باریکیوں اور زرکتوں سے  
نا آشنا نہیں ہے، البتہ غفور کی شخصیت نے مجھے ایک لحاظ سے ضرور چونکا کیا،  
اور مخفی سے اٹھانے کے بعد بھی میں چار ہا کہ اس کا باس کتنا بے شکن تھا، مگر اس سے  
چہرے پر کتنی تسلیمیں نہیں۔ آنکھوں اور ہنوزوں کے گوشوں کے پاس پھیلی ہوئی  
تسلیمیں، سوتیوں ایسی باریک باریک تسلیمیں جن میں سے کچھ اس کے باقیں کرنے  
سے اور کچھ باتیں نہ کرنے سے پیدا ہوتی تھیں۔

مگر یہ کچھ ایسی شدید قسم کی سوچیں نہ تھیں کہ میرے ذہن پر سلط ہو جاتیں۔ چھر  
مجھے وہ جاننے والے یاد آگئے جن کے باس تو شکنوں سے پڑھتے تھے، مگر ان  
کے چہروں پر تندرستی کے فانوس جلتے رہتے تھے۔ جسم اور باس کے درمیان یہ خلیج  
کہاں حاصل نہیں ہوتی۔ ہترین بآسوں میں کیسے کیسے سخنی پکر جھپے رہتے ہیں اور  
کیسے کیسے ترشے ہوئے جسم، بے دھنگ، دھیلے دھالے بآسوں میں، رائیگاں  
چلے جاتے ہیں۔

غفور سے میری دوسری ملاقات سال ڈیڑھ سال بعد ہوتی۔ وہ ایک بار ورنہ  
مرک کے کنارے، ایک بجوم میں کھڑا ماری کا تاشاد کیکھ رہا تھا۔ میری نظر اس پر  
محض اس لئے پڑ گئی کہ وہ اپنے باس کی وجہ سے سارے بجوم سے الگ معلوم ہو  
رہا تھا پہلے مجھے شبہ سا ہزا کر رہ غفور ہے۔ قریب جا کر دیکھا، تو وہی بے شکن باس  
اور وہی شکنوں سے بھرا ہوا چہرہ۔ البتہ اب شکنوں کی سوتیاں سلاستیاں ہو رہی تھیں۔  
میں نے سلام کیا تو ایک شنبی کے لئے مجھے غور سے دیکھا۔ پھر جیسے جھپٹا اور مجھے  
سے پٹ گیا۔ مجھے بجوم سے الگ لے آیا۔ میں نے پوچھا ہوا آج کل کیا مشاغل ہیں؟

ہنس کر بولا۔ ”بیوی، ماریوں کے تاشے دیکھتا ہوں؟“

میں نے کہا۔ ”اور وہ بیوہ ایکھنٹی کیا ہوتی؟“

”بیوہ ایکھنٹی؟“ اُس نے پوچھا۔ ”ہاں، وہ بیوہ ایکھنٹی۔“ جیسے اسے کچھ یاد آگیا۔

پھر سکراکر بولا۔ ”پہنچنی وہیں یہ عاک جہاں کا خیر تھا۔ یعنی یہ پیشہ میں نے ان لوگوں کے پرہد کر دیا جو اسی پیشے کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ میں نے قاب وہاں — کیا کہتے ہیں۔ — خانیوال میں ایک ہوٹل کھول رکھا ہے اور اللہ کا بڑا کرم ہے۔“

پھر کچھ ادھر ادھر کی باتیں ہوتیں اور یہ باقیں اس نے یوں بے تکلفی سے کھل کر کیں کہ مجھے بھی تکلف سے قطع نظر کرنے میں کوئی ایسی جگہ نہ ہوتی۔ میں نے کہا۔

”اس روز آپ سے پہلی ملاقات کے بعد میں ایک عجیب صورج میں پڑ گیا تھا۔ نیا نیا تعارف ہوا تھا۔ اس لئے آپ سے اپنی مشکل حل کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ آپ دوسری ملاقات ہوتی ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے ہم نے بچپنے سال ڈریوسال کا عصر اکٹھے گزارا ہے۔ سوچوں ہی سوچوں میں انسان ایک دوسرے کے کتنے قریب آ جاتے ہیں۔“

”راتی!“ وہ بولا۔ ”اب آپ ملے ہیں تو میں یہ بھول ہی گیا تھا کہ آپ کے ساتھ یہ میری دوسری ملاقات ہے۔ مگر وہ آپ کی مشکل کیا تھی؟“

میں نے کہا۔ ”پہلے میں اپنی بے تکلفی کی معافی مانگ دیں۔“

”سکراکر بولا۔“ دے دی معافی۔ اب فرمائیتے؟“

میں نے کہا۔ ”یہ بتائیتے کہ آپ کا لباس کتنا بے شکن ہے، مگر آپ کے چہرے پر اتنی بہت سی لشکریں کیوں ہیں؟“

اس کے تیور تبار ہے تھے کہ اسے مجھ سے اس سوال کی توقع نہیں تھی۔  
 اس نے وہ سمجھا ہوتے ہوئے رہ گیا اور جیسے ہنسی پر ضبط کرتے ہوئے بولا: "اس  
 لئے کہ میں سوٹ کو اپنے بستر پر ٹھا دیتا ہوں اور خود سوٹ کیس میں بند ہو جاتا ہوں؟"  
 ہم دونوں ذرا دیر ہنسنے رہے پھر وہ بولا: "اگر میں یہ کہوں کہ یہ فکر کی شکنیں  
 ہیں تو یہ نہ سمجھنے کا کہ میں اپنے آپ کو مُفکر شاہت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں  
 مُفکر کرنے کا حق صرف منکروں کو حاصل نہیں ہے۔ ایک کسان بھی اس بات پر  
 غور و فکر کر سکتا ہے کہ کل شام سے پہلے، جسمانی ہوتی ابا بیلیں آسمان پر اڑتی پھر  
 رہی تھیں اور میں پیاسی ہوں، میں پیاسی ہوں، کی فریادیں کر رہی تھیں تو بادل  
 کیوں نہ آمدے اور بارش کیوں نہ ہوتی۔ کسان کے نزدیک تو یہ قدرت کا  
 قانون ہے کہ جب ابا بیل صفات آسمان کے پس منتظر میں روتے گئی تو میںہر سے  
 گلا۔ ہے نایہ بات؟"

"جی!" میں نے اعتراف کیا۔ حالانکہ مرسومی پیش گوتی کے اس طریقے سے میں  
 بالکل بے خبر تھا۔

"سامنے ریستوران میں کیوں نہ جائیجیں؟" اس نے بخوبی پیش کی۔ "آپ کو  
 اس وقت کوتی ضروری کام تو نہیں ہے؟"

"جی نہیں!" میں نے کہا۔ "ہوتا بھی تو ملتوی ہو سکتا تھا۔ آپ سے ملاقات  
 روز روکھوڑی ہوتی ہے۔"

وہ بہت خوش ہوا، مجھے ہاتھ سے کپڑا، اور سمجھ ریستوران میں لے آیا،  
 جس کی چورائی تو باہر اس کی پیشانی پر لگے ہوتے بورڈ کے پر ابر تھی، مگر لمبا تھا  
 دُور مضمود شنی میں ڈوبتی ہوتی معلوم ہو رہی تھی۔ بس ایسا لگتا تھا کہ شر قائنگا  
 کنوں کھدا ہوا ہے مقام کو سیاں خالی پڑی تھیں۔ مگر تباکو کی بوئے یہ

ریستوران میں بھرا ہوا تھا۔ دُور دُبیرے دیوار کے ساتھ ہوں گے کھڑے تھے،  
جیسے پچھوڑ تو لڑک جائیں گے۔

اس کنوئیں کے پامیں جا کر وہ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوتے بولا۔ ”میں کہہ رہا  
تھا کہ بس میں سوچتا رہتا ہوں۔ اب میں کھڑا بھٹاہر ماری کاتما شادی کو رہا تھا مگر اس  
میں سوچ رہا تھا کہ یہ جو اُس نے اپنی گذی پر گھونسہ مار کر منہ سے لوہے کا اتنا بڑا گولہ  
برآمد کیا ہے اور اتنے بہت سے دو دھارے بلید نکالے ہیں تو وہ ایسا کیوں کر رہا  
ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ”لقد فلقنا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَفْعِيلٍ“ اور اسی انسان کو  
اکتنی دولی کے لئے کیا کیا پاڑ نہیں بلیں پڑتے اور پھر۔۔۔ وہ یکاںک رُک گیا اور  
جیسے چونک کر کھڑا ہو گیا۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر بولا۔ اس سوچ بچارہ کی وجہ سے  
ذہن کا یہ عالم ہو رہا ہے کہ میں جو کوئی دس پندرہ منٹ تک مداری کا تماشاد کرھتا  
رہا ہوں، اسے کچھ دینے بغیر یہاں ریستوران میں آبیٹھا ہوں۔ بعض اوقات ہمدردی  
کے جوش میں ہم سے کسی کسی غیر ہمدردانہ حرکتیں سر زد ہو جاتی ہیں سایک منٹ کرنے  
اجازت دیجتے۔ میں مداری کو اس کا معاوضہ دے آؤں یہ دو قدم حل کر دوڑ کا اور بولا۔  
”معاوضہ کے لفظ پر غور کیا آپ نے؟“ خود مداری بھی اسے خیرات ہی کئے گا، مگر میں  
اسے معاوضہ کرنے پر صفر ہوں۔“

غفور کے کردار کا یہ مُخ بھے بہت پیارا لگا۔ میں اسے نجیب ریستوران کے  
کنوئیں میں سے سکھتا ہو ادیکھتا رہا۔ کاؤنٹر کے پاس پیچ کر اس نے میخر سے کوئی بات کی  
اور پھر باہر نکل گیا۔ فون دا پس آکر بولا۔ ”پاۓ نہیں آتی ابھی تک؟“  
”آ جاتے گی۔“ میں نے کہا۔

اُس وقت ایک بیرا، چاتے لے آیا اور دسرے نے سینڈوچ، پیٹی، کیک  
پیسٹری اور بیکٹ سے بھری ہوئی ڈشوں کا ایک طشت لا کر رکھ دیا۔ میں نے اس انبار

سے بوکھلا کر کچھ کہنا جاہا، مگر اس نے بھی میری نیت بھانپ لی اور بولا۔ "آپ کو یہ ریستوران عجیب سالگر رہا ہو گا۔"

"جی نہیں" میں نے کہا۔ "بس یہ ہے کہ چڑھاتی فراخ ہے۔"

"یوں کہئے کہ لمبا نی زرازیار ہے۔" وہ بہسا۔ میں نے ایک دن اس کے میخسر سے پوچھا تھا کہ تمہارے ریستوران کے جغڑا فیٹ کو کیا ہو گیا ہے؟ بولا۔ "یہ میری قبر ہے، جو بھٹکے سے حساب کتاب لینے سختی آ رہی ہے۔" میں نے پوچھا۔ "آپ کا ہوٹل کیسا ہے؟"

"اچھا ہے با" وہ بولا۔ "خاصا ہے، مٹان کے ایک مشور پوک، حسین آگاہی میں ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "تو کیا مٹان میں بھی ہے آپ کا ہوٹل؟"

"جی ہاں؟" وہ تیزی سے بولنے لگا۔ "ہاں سے — وہ کیا کہتے ہیں۔"

خانیوال سے بسم اللہ کی کام چل نکلا تو ایک شاخ مٹان میں کھول دی۔ اب سوچ رہا ہوں، بہادر پوہنچ میں بھی کسی مناسب جگہ کا انتظام کروں۔ کار و بار پھیلے تو پھیتا ہی چلا جاتا ہے؟ بے اختیار ایک تقدیر مار کر بولا۔ "اور سکڑے تو نجیب ریستوران بن جاتا ہے۔" — چلتے کا ایک گھونٹ پی کر دہ پھر بولنے لگا۔ "مگر مجھے یہ ریستوران پسند ہے۔ مجھے یہ ڈاپر اسرار سالگرتا ہے۔ بالکل الف لیلہ کا سا۔ میں یہاں گھنٹوں آنکھیں بند کر کے جادو کے غالپے پر بیٹھا اڑتا رہا ہوں۔ ایسا سکون ہے یہاں کہ سگریٹ کا کش لگا کر دھواں پھوڑیتے تو وہ اوپر نہیں جاتا۔ آپ کے آس پاس دیرینک مکڑی کا جال اس بندار ہتا ہے۔ ایسے ماحد میں سوچتے تو بڑا فراہما تا ہے۔ کچھ بھی سوچتے، یہی سوچ یعنی کہ یہ جو سامنے پیرا کھڑا ہے تو یہ صرف بیرا نہیں ہے، ایک ماں کا بیٹا، ایک یوں کا شوہر، ایک بن کا بھائی اور ایک بیٹی کا باپ بھی ہے۔"

چہرہ اس دلک کا شری بھی ہے، چہرہ اس انسانی براہدی کا ایک دلک بھی ہے،  
جو عموماً کام لے لیتی ہے مگر دام نہیں دیتی۔ تو یہ صرف یہ را نہیں ہے کہ آپ کے سامنے  
چلتے لہ کر رکھتے گا اور اس کا فرض پورا ہو جائے گا۔ نہیں۔۔۔ اسے ماں کی  
دوا بھی لانی ہے، بیوی کا جوتا بھی خریدنا ہے، بہن کے لئے طاپس اور بیٹی کے لئے  
گڑیا کا انتظام بھی کرنا ہے۔ پھر اس کی رشته داریاں ہوں گی، دوستیاں ہوں گی،  
متناہیں ہوں گی، یہ دویا ہو گا؛ اُس نے ٹوٹی راتوں کو دعائیں مانگی ہوں گی۔ اُنہوں  
اپ کے میری لاٹری تکل آئے۔ اللہ آج صحیح گھر سے نکلوں تو سوسو کے نوٹوں سے  
پھولا ہوا بڑا مجھے سڑک پر ٹڑا مل جاتے۔۔۔ آپ بور تو نہیں ہو رہے؟“  
”نہیں نہیں۔۔۔ میں نے کہا، اور میں نے ٹھیک کہا۔

یک ایک زرد نعمتوں کے دھنے لے آجائے میں، مجھے غفور کے چہرے کی شکنیں  
خراشیں بنتی نظر آئیں۔ وہ اپنے ہاتھوں کو مردٹنے کی حد تک سلا رہا تھا۔  
”میں یہی کمزوری ہے میری۔۔۔ اس کی آواز بھی بدلي ہوئی تھی۔۔۔ آپ ہی  
بتابیتے، ایسی سوچوں سے چہرے پر شکنیں نہیں پیدا ہوں گی تو کیا گلاب کھیں گے؟  
کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ میرے چہرے کی شکنیں میری نہیں ہیں، پرانی ہیں۔ اس  
لئے کہ یہ پرانی سوچوں نے پیدا کی ہیں۔ اپنے بارے میں تو میں نے بہت کم سوچا ہے۔  
اول تو دوسروں کی سوچوں سے فرصت ہی نہیں ملتی۔۔۔ پھر اپنے بارے میں سوچنے  
کی کوئی ایسی گنجائش بھی نہیں ہے، اُنہوں کا دیا ہوا بہت ہے اور عام فارغ الیال  
آدمی، زیادہ سے زیادہ یعنی سرچ سکتا ہے کہ دُور جہاں سمندوں کے ساتھوں پر  
ناریں کے درخت چھاتے لئے کھڑے ہوتے ہیں اور مچھریں اپنے نچھریوں کی  
واپسی کے لئے ناج ناج کر اور گا گا کر، اپنے معبودوں کی پوچھا کرتی ہیں، وہاں  
وہ سفری باس پہنے، ایک غیر ملکی سیارہ کی عیشت سے جانکلے اور مچھریوں کے

بیٹوں، بیٹیوں کے ہاتھوں پر چھوٹے چھوٹے نکلے رکھ کر اور ان میں بسکٹ اور ٹافیاں  
بانٹ کر، اپنے احسوس برتری کے خسارے میں بھرا پھر سے خدا کا شکر ہے، کہ میں  
ان فارغ الیالوں میں سے نہیں ہوں۔“

مجھے محسوس ہوا جیسے وہ جان بوجھ کر دیکھ گیا ہے اور مجھے اس وقت کچھ نہ کچھ  
ضرور بونا چاہیے، سو میں نے یونہی کہہ دیا۔“یکن جب آپ دوسروں کے بارے  
میں سوچتے ہیں، تو دراصل اپنے بارے میں سوچ رہے ہوتے ہیں۔“

میرا مقصد اس کی تعریف تھا، مگر اس کی آواز غاصبی بندہ ہو گئی۔“ دیکھئے،  
یہاں سے ہاؤں کا رُخ نفسیات کی طرف ٹڑ جاتے لگا اور جدید علم نفسیات سے مجھے  
ایک بڑی شکایت ہے۔ جب اس سے کوئی بات نہیں بنتی تو وہ بات رکھنے کے لئے  
کوئی بات گھر دیتا ہے۔ جب کوئی شخص اپنے سے بڑی غر کی عورت سے پیار کرتے  
تو یہ علم کہتا ہے کہ اس بیچارے کو ان کا پیار لصیب نہیں ہوا۔ جب کوئی آدمی اپنے  
ملک کی آن پر قرآن ہو جاتا ہے تو یہ علم کہتا ہے کہ جسی زندگی میں پے در پے نکستوں کے  
بعد اس کے سلسلے صرف یہی راہ فرار تھی۔ یہ علم اگر عام ہو جاتے تو مذہب، اخلاق اور  
تہذیب کی دُنیا خالی ڈھنڈا رہ کر رہ جاتے۔ یعنی، اکبر، دردی اور بدی جلت بن جاتے۔  
آپ کہتے ہیں، میں دوسروں کے بارے میں سوچتا ہوں تو دراصل اپنے بارے میں  
سوچ رہا ہوتا ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں رہا رہا است اپنے بارے میں سوچنے  
سے گھبرا تا ہوں۔ مگر میں کیوں گھبرا دیں؟ اگر آپ مجھے اپنی طرح جانتے ہو تو آپ  
کو معلوم ہوتا کہ میری جنسی گھر میو، معاشی اور معاشرتی زندگی سب ایسی تصویریں میں  
جو اتنی مکمل ہیں کہ اگر خود مصور بھی چاہتے تو ان میں ایک ذرا سے خم، ایک نجھے سے  
نقٹے کا بھی اضافہ نہ کر سکے۔ میں جب دوسروں کے بارے میں سوچتا ہوں تو اس کا  
مطلوب یہ ہوتا ہے کہ میں اپنی طرح دوسروں کی شخصیت کی تکمیل چاہتا ہوں۔ مگر جب

میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ تکمیل میرے بس میں نہیں ہے۔ پورے معاشرے کے بس میں نہیں ہے تو میرے چہرے پر ایک اور شکن انہرائی ہے اور نیری غر کے پڑیکی ایک اور شہنسی، ٹوٹ جاتی ہے۔  
وہ چاٹے کا ایک گھونٹ پینے کے لئے رکا، تو میں فوراً بولا۔ «معاف کیجئے میرا مطلب وہ نہیں تھا جو آپ سمجھے۔»

چاٹے پیے بغیر اُس نے پیالی رکھ دی اور بولا۔ «اگر آپ کا مطلب وہ نہیں تھا جو میں سمجھا تو یوں سمجھتے کہ میں نے اب تک جو کچھ کہا ہے وہ آپ سے نہیں کہا، عام دنیا سے کہا ہے۔ دنیا غوما یہی سمجھتی ہے کہ میرے چہرے کی شکنیں میری اپنی ہیں۔ پرسوں میں، دہان سے۔۔۔ کیا کہتے ہیں۔۔۔ ملان سے لاہور آ رہا تھا کہ طرین میں ایک خاصی بچتی غر کے جوان نے مجھ سے کہا۔ «چاچا جی! ذرا سا ادھر ہو جائیے۔» میں ذرا سا ادھر ہو گیا، منگراس سے پوچھا۔ بھتیجا جی!  
آپ کے خیال میں میری غر کیا ہو گی؟، دہ بولا۔ یہی کوئی پہنچا لیں پہچاں، میں نے کہا، اور اگر بتیں چونتیں ہو تو کیا آپ چاچا جی کا خطاب واپس لے لیں گے؟  
وہ گھبرا کر مجھے گھوڑنے لگا جیسے پوچھ رہا ہے کہ اگر یہ بات ہے تو پھر یہ کیا بلایہ ہے؟  
میں اس کی شکل کو سمجھ گیا۔ اس نے ہنس دیا۔ وہ بھی کھسیا کر بننے لگا، اور بات آئی گئی ہو گئی۔ مگر میں لاہور تک یہ ضرور سوچتا رہا کہ یہ نوجوان میرے ان تمام مہربانوں کا نمائندہ ہے جو مجھے نہیں دیکھتے میری شکنوں کو دیکھتے ہیں۔۔۔ «پھر وہ زور سے ہنس کر بولا۔ آپ بھی تو ابھی ابھی ان مہربانوں میں شامل ہوتے ہوتے رہ گئے ہیں۔»

«نہیں نہیں۔۔۔ میں نے اپنی بات دہرائی۔۔۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔۔۔  
اُسی نے مُکدا کر میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دبایا اور کچھ دیر تک پوہنچی۔۔۔

بیٹھا رہا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہاں اتنی دیر ہو جائے گی۔ اس لئے بہت سے ضروری کام ایک دن یاد آگئے تھے۔ میں فوراً جانما چاہتا تھا، مگر اس ڈر کے مارے کر کیں وہ اس کے بھی کوئی دوسرا مفہوم اندازہ کرے، چنپ چاپ بیٹھا رہا۔

یک ایک دہ بولا۔ ”میں نے بھی میزبانی کی انتہا کر دی۔ سارا وقت آپ کو باقتوں میں لگاتے رکھا اور آپ کو صرف آیا۔ — بلکہ ایک کیا، آدھا سینٹ دوچ کھانے کی نہلٹت دی۔ لاحول ولا قوت۔“

”اوہ خود آپ نے چائے کی ایک پیالی بھی پوری نہیں بنی۔“ میں نے کہا۔

”دیکھتے“ دہ بڑی منت سے بولا۔ ”میری خاطر تھوڑا سا پچھو کھایجئے۔ میں

بھی عجیب ہوئی آدمی ہوں۔“

میرا سچ پچھ جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس لئے بولا۔ ”اصل میں ایک سینٹ دوچ میں نے یہاں کھایا ہے، ایک اور سینٹ دوچ ایک فی پارٹی میں جا کر کھا نا ہے۔ دو پر کے بعد کی چائے پر میں اس سے زیادہ چاہوں بھی تو نہیں کھا سکتا۔“

”تو آپ کسی پارٹی میں جا رہے تھے؟“

”جی ہاں!“ میں نے کہا۔ ”مگر آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں، مجھے آپ نے نہیں روکا ہے۔ میں خود کہا ہوں، اور ابھی بہت وقت ہے، پہنچ جاؤں گا۔“

وہ مجھ سے پہلے اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھ سے متواتر کئی معانیاں مانگیں۔ میرے آگے آگے چلنے لگا۔ کاؤنٹر کے فریب سے بھی گزر گیا۔ دروازے کے پاس ڈک کر میں نے کہا۔ ”مگر وہ بیل بھی تو ادا کرنا تھا۔“

بولا۔ ”بلکہ نہ کہجئے۔ یہاں میرا حساب پلتا ہے۔“ باہر لکھ کر دہ ہنسنے لگا۔ ”میں یہاں نہیں ہتھا تو کئی دوست آکر یہاں میرے حساب میں چائے پی جاتے ہیں اور میں جس دا پس آگر بیل ادا کرتا ہوں تو ایسا لطف آتا ہے، ایسا لطف آتا ہے کہ کیا عرض

کر دوں۔“

میں نے مصالحتے کے لئے ہاتھ بڑھایا، تو اُس نے مجھے ہاتھ سے کھینچ کر یعنے سے لگایا۔ پھر بولا۔“ میں کچھ دنوں کے لئے ادھر وہ — وہ — ملٹان جا رہا ہوں۔ آؤں گا تو ضرور ملاقاتات ہو گی۔ چار پانچ ہفتے بعد آپ کا ادھر سے گزر ہو تو یہیں ریستوران سے پوچھ لیجئے گا؛ ”

“ ضرورا! ” میں نے کہا۔“ خدا حافظ! ”

“ خدا حافظ! ” وہ بولا اور ریستوران میں داخل ہو گیا۔

میں اس کے بعد بخوبی ریستوران کے سامنے سے دوبار گزرا، مگر دنوں یا ر پکھھا ایسی تیزی میں تھا کہ غفور سے کے بارے میں نہ پوچھ سکا۔ پھر دوسری ملاقاتات پر اس کی باتیں اور سوپیں مجھ پر یوں چاروں طرف سے چل دیں اور ہوتی تھیں کہ میں اس کا سامنا کرتے ہوئے گھبرا آبھی تھا۔ دراصل بعض لوگوں کی شخصیتیں کچھ ایسی ہمہ گیر قسم کی ہوتی ہیں کہ ان کی چاروں یواہی میں انسان بالکل ڈبک کر رہ جاتا ہے اور میں اس روز غفور کی شخصیت کے خول میں بالکل محظ کر رہ گیا تھا۔

یہ کوئی سات آٹھ ہفتے بعد کی بات ہے جب میں شام سے کچھ دیر پہلے بخوبی ریستوران کے سامنے سے تیسرا بار گزرا۔ میں شاید یونہی نکلا چلا جاتا۔ مگر جب میں نے ریستوران کے در داڑے کی طرف دیکھا تو مجھے گمان سا ہوا کہ دہان آخری سیڑھی پر بازو پر بازو چڑھاتے اور دوائیں بائیں ہاتھوں کو بغدوں میں رکھتے غفور کھڑا ہے۔ عجیب بات یہ تھی کہ اُس نے سوٹ کی بجائے دھاری دار پاچا م اور ڈھیلی ڈھالی سی شیر و انی پین رکھتی تھی۔ اتنی ڈھیلی کہ اس میں غفور کا جسم مجھ سکھڑاں میں لکھتی ہوتی آہنی زبان کی طرح جھوٹا محسوس ہوا۔

میں اس کی طرف بڑھا تو جب بھی اُس نے کوئی حرکت نہ کی۔ البتہ جب میں اس کے بالکل قریب پہنچ گیا تو وہ چونکا۔ آخری سیر ہمی پر سے کوڈ کر مجھ سے پشت گیا۔ پھر بولا۔ ”کیا آپ یقین کریں گے کہ میں یہاں کھڑا کئی گھنٹوں سے آپ ہی کی راہ دیکھ رہا تھا؟“

اس کے دھوے سے اختلاف کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ اس لئے میں نے بات میں پیچ ڈال کر کہا۔ ”مگر آپ کو کیسے معلوم ہو گیا کہ آج میرا دھر سے گزد ہو گا؟“ ”وہ بولا۔“ سو کھے غلظت درخت کو کیسے پتہ چل جاتا ہے کہ بہار آرہی ہے اور بہار کے استعمال کے لئے اس میں کون پلیس کیوں پھوٹنے لگتی ہیں؟ پیش بینی کی وقت کسی میں نہیں ہوتی۔ سچتے تکم بخوبی اسے گھنٹوں پلے رونے لگتے ہیں۔“ غیر محسوس قوتوں کے سامنے منطقی کو ہتھیار ڈال دینا پڑتے ہیں۔ اس لئے میں نے موضوع بدل کر کہا۔ ”نسایئے مزاج کیسے ہیں؟“

بولا۔ ”اللہ کا شکر ہے۔ کل شام ہی کو کوتھہ سے آ رہا ہوں اور آج صبح ہی سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔ کچھ ایسے اعتماد کے ساتھ ہیسے میں نے آپ کو اپنی آمد کی اطلاع دے رکھتی ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”کوئی بھی بہسلے میں جانا ہوا؟ اس سے پہلے تو آپ خانیوال اور ملماں میں تھے۔“

اُس نے زور کا تھقہ لگایا اور بولا۔ ”وہ کٹ پیس کا کار و بار میرے بس کی بات نہیں تھی، اس لئے بھاگ آیا۔“

میں نے کہا۔ ”مگر آپ نے تو وہاں ہر ٹول کھول رکھتے تھے۔“

اُس نے فوراً ایک اور تھقہ لگایا۔ ”اچھا تو یہ کٹ پیس کا تھقہ آپ کو معلوم نہیں ہے۔ ہر ٹول تو میں نے یہاں سے واپس جاتے ہی پیچ ڈالے تھے۔ یہ اتنا پھیلنا ہوا کام ہوا۔“

ہے کہ اکیلا آدمی بالکل پاگل ہو کر رہ جاتا ہے۔ سو اس کے بعد میں پنڈی چلا گیا اور وہاں کٹ پیس کا کار دیار شروع کر دیا۔ پھر جب دیکھا کہ اس منٹے میں میرا دماغ بھی کٹ پیس بنا جا رہا ہے تو میں نے اُدھر کو تھٹے کی طرف جا کر ایک ایسا کار دیار شروع کر دیا کہ..... ذرا سار گر کر بولا۔ اس کی تفصیل یہاں نہیں بتا دیں گا۔ چلتے انہوں چل کر بیٹھیں۔ آپ کو کوئی فرودی کام تو نہیں ہے؛ پھر مُسکب اکرم بولا۔ کسی نبی پاری دغیرہ میں تو نہیں جانا ہے آپ کو؟“

میں نے کہا۔ بڑی تیز یادداشت ہے آپ کی۔“

چہرے پر ہاتھ پھیر کر مسکراتے ہوئے بولا۔ یہ شکنیں یونہی قو نہیں لئے پھرتا ہوں۔“  
یہی نے اس ملاقات میں پہلی بار اُس کے چہرے کو خور سے دیکھا، اور مجھے محسوس ہوا کہ جو شکنیں چند ہیں پہلے ایک دوسرے کے متوازی چلتی تھیں، اب ایک دوسرے کو کھلتی ہوئی گزر رہی ہیں اور اس کی جلد بالکل چارخانہ ہو رہی ہے۔ ان شکنیوں نے مجھے فوراً شاید اس لئے متوجہ نہیں کیا تھا کہ اس سے پہلے اس کے چہرے کی شکنیوں اور بارس کی بے شکنی کے درمیان کوئی ربط نہیں ہوتا تھا۔ اور بے ربطی نظر وہ کو حسن دتوازن سے بھی نہیا دہ تیزی سے جگڑ لیتی ہے مگر آج اُس کے چہرے کی شکنیں جیسے اس کی گذلن پر سے اُتر کر اس کی شیر دانی میں سراہیت کر گئی تھیں۔ میں نے اسے پہلی بار شیر دانی میں دیکھا تھا۔ مگر شیر دانی سے زیادہ عجیب چیز اس شیر دانی کا بے دُعنگا پن تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اسے مشکل میں سے نکال کر لایا ہے۔

«آپ ہیران کیوں کھڑے ہیں؟ وہ بولا۔“ میں نکلا تھا اس شیر دانی کو استری کرنے میکھ پھر سوچا کہ تک اسے بازو پر اٹھانے اٹھانے چھروں گا۔ سوچنے لی۔ مگر آپ کے انتظار میں استری کرانے کی فوبت ہی نہیں آئی۔ بھتی خدا کی فتح مجھے آپ کا انتظار تھا۔“

میں نے اُس کا ہاتھ اپنے باتحہ میں لے کر پیار سے دبایا۔  
تم بخوب ریستوران کی اتھاگھرا ہیوں میں ڈوب کر پرے کونے میں اسی  
پرلنی میز پر جائیٹھے۔ میز پر ایک گلاس رکھا تھا جس میں تھوڑا سا پانی تھا۔ غفور نے  
گلاس اٹھایا اور پانی پی کر کرنسی پر بیٹھ گیا۔

”دیکھ کیا کیا آپ نے؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”پانی جھوٹا تھا شاید۔“  
”جی ہاں!“ وہ بولا۔ ”جھوٹا تھا، مگر میرا ہی جھوٹا تھا۔ میں بہت دیر سے یہاں  
بیٹھا ہوں نا!“

بیرے کو چاٹے کا آرڈر دے کر وہ آہستہ سے بولا۔ ”اب بتاؤں؟“  
میں نے کہا۔ ”جی ہاں جی ہاں! تو وہ کون سا خفیہ کار دیوار ہے جس کا ذکر صرف  
اس گوشے میں ہو سکتا ہے۔“

”سمنگنگ!“ وہ بولا۔

جیسے اُس نے گلاس اٹھا کر میرے منہ پر دے ادا۔  
”سمنگنگ!“ میں نے پوچھا۔ ”یعنی آپ سمکھر ہیں؟“  
میں نے گھبرا کر اپنے سگرٹ کیس سے ایک سگرٹ نکال کر سندھا لیا۔  
”اگر میں یہ کہوں؟“ وہ بڑی سنجیدگی سے بولنے لگا۔ ”اگر میں یہ کہوں کہ میں سمنگنگ  
کی کار دیواری میں کا ایک پر زد ہوں تو شاید میں غلط بیانی نہیں کروں گا۔“  
مجھے خاموش پاکروہ پھر بولا۔ اور اگر میں یہ بھی کہہ دوں کہ آپ بھی اسی میں کے  
ایک پر زد ہیں تو یہ بھی غلط بیانی نہیں ہوگی۔“

”مگر کہہ رہے ہیں آپ؟“ میں نے حیران ہو کر احتжалج کیا۔ ”سمنگنگ سے مجھے نفرت  
ہے۔ میں اس پیشے پر تھوڑا ہوں۔“

وہ فوراً بولا۔ اور یہی تھوکی ہوئی چیز آپ کی زندگی کے قریب قریب ہر شبے

میں رچی ہوتی ہے۔“  
میں نے دبے دبے غصتے سے پوچھا۔ ”کیا آپ اس ارشاد کی وضاحت  
فرمائیں گے؟“

”وہ بولا۔“ دیکھتے یہ سمجھت جو آپ پی رہے ہیں سمجھل کیا ہوا ہے۔ اس کی درآمد  
ہمارے تک میں منسون ہے، مگر اس کی رسائی آپ کے صرف ہاتھوں تک نہیں۔  
آپ کے بھی پھرلوں تک ہے۔ کون جانے آپ نے غیر محلی کپڑے کا جو سوٹ پین  
رکھا ہے وہ کراچی کی بندگاہ پر اتراتھا اور اس پکشم ادا کیا گیا تھا، یا یہ ساحل بھر کی  
کی طرف سے اوٹھوں پہ لگر سندھ کے کسی شہر میں پہنچا اور...“  
”اس طرح تو ہمارے ہاں کا بچہ بچہ سمجھنگ کی مشین کا پُر زہ ہوا۔“ میں نے  
ٹڑا گما۔

”مگر دہ جیسے فاتحانہ شان سے بولا۔“ تو میں نے شروع میں یہی تو عرض کیا تھا۔  
”بچہ۔۔۔ ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”بچہ یہ کہ میں بھی کچھ ایسا ہی سمجھر ہوں۔“

”یہ تو کوئی ایسی بات نہ ہوتی۔“ میں نے کہا۔

”ایک بات ہے۔“ وہ بولا۔ ”بات یہ ہے کہ آپ جو مال خرید کر سمجھنگ کرتے  
ہیں، میں ڈھی مال بچ کر سمجھنگ کرتا ہوں۔“ دیکھتے۔ میں آپ کو سمجھا ذل۔ سرحد پار  
سے مال سمجھ کرنے والے بھی اور ہیں اور شہروں تک پہنچانے والے بھی اور ہیں۔  
میں اس مال کا صرف خریدار ہوں۔ میں اسے خرید کر بیچ دیتا ہوں۔ آپ اسے خرید کر  
استعمال کر رہتے ہیں۔ ایک لمحاظ سے میں آپ سے بھی ذرا کم درجے کا سمجھر ہوں۔  
آپ کے ہم دونوں نے ایک ساتھ زور کا قہقہہ لگایا اور ابتدائی گلشنگ  
کی کوفت کچ کم ہو گئی۔

بیرا چاٹے لایا تو لشت میں چائے، چینی اور دودھ کے سوا کچھ نہ تھا بیرے کو ملامت کرتے ہوتے اُس نے کہا۔

”کام تھا رے دماغ میں اتنی ذرا سی بات بھی نہیں آئی کہ میں جو ایک سفر نہیں تھا اس سے پہنچ کر لایا ہوں تو اسے صرف کھولتے ہوئے پانی پر نہیں ٹڑھاؤں گا بلکہ۔“

”جی نہیں!“ میں نے فوراً تکلف برتا۔ ”میں صرف چاٹے پیوں گا۔ شام کا وقت ہے۔ اس وقت کچھ کھالیا تو کھانا کیسے کھایا جائے گا؟“

غفور مسکرا کر بولا۔ ”وکیا آج کسی ڈنر میں جانے کا ارادہ ہے؟“

”جی نہیں!“ میں نے کہا۔ ”آخر گھر میں بھی تو انسان کھانا ہی ہے۔“

”تو آج ہیرے ساتھ کھایجئے گا۔“

”کھالوں گا۔“ میں نے ڈر کر حامی بھر لی۔

”تو پھر ٹھیک ہے۔“ وہ بیرے سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”ٹھیک ہے بھتی جیک ہے۔“ بیرا چل دیا تو بالکل میرے کان کے پاس منہ لا کر بولا۔ ”کوٹ دیکھا تھا اس بیرے کا؟“

”جی نہیں!“ میں نے کہا۔ ”میں نے غور نہیں کیا۔“

مسکرا کر بولا۔ ”شارک سکن کا کوٹ پسند ہوئے ہے کم بخت۔“

میں نے پیٹ کر دیکھا، تو بھیب ریستوران کی آدھی رات کے مانچے پر بیرے کا کوٹ چاند کی طرح چلکتا نظر آیا۔ پھر جب میں نے جیزاں ہو کر غفور کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔

”سمنگنگ کامال ہے۔ مجھ سے خرد ہے اور بھلا بتائیتے تو کتنے میں خرمدا ہو گا۔ نہیں آپ نہیں بتا سکیں گے۔ کُل پانچ روپے میں۔“

”حمد ہے،“ میں نے کہا۔ ”تو کیا آپ سیکنڈ ہینڈ کپڑوں کا کاروبار کرتے ہیں؟“

”فرست کلاس سینئنہ ہیئت کپڑوں کا، وہ مسکرا کر بولا۔ ایران کے بڑے بڑے  
افروں اور جاگیرداروں کے کپڑوں کا۔ میراڑہ کوتہ ہے۔ بڑے سمجھکر یہ کپڑے ایران  
سے بلوچستان میں لاتے ہیں۔ ان سے چھوٹے انہیں کوتے لے آتے ہیں، اور  
دہائی سے ہم نخنے مُنچے سمجھکر انہیں کراچی، لاہور اور راولپنڈی، پشاور تک پہنچاتے ہیں؛  
مگر سچی بات ہے میں ضمیر کو تھیک نہیں رہا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب مال  
کوتے کے بازار میں پہنچ جاتا ہے تو اس کی غیر قانونی حیثیت کی ”غیر“ گھس چکی  
ہوتی ہے۔“

”د د سنتے لگا۔ پھر بولا۔“ اب میں ایک پُراؤ بھن بک کر کے پندی جارہا  
تھا تو سوچا، ایک دانہ آپ کی نذر کرتا جاؤں۔“  
”دانہ؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”جی ہاں!“ وہ بولا۔“ ایک کوٹ ہے۔ میں نے اسے دیکھا تو یوں لگا، جیسے  
درزی کی دکان سے سیدھا سمجھکر کے ہاتھ میں آگیا ہے۔ بالکل برینڈ نیا۔ آپ اسے پسند  
کریں گے، پیش کروں؟“

”اس وقت کہاں جاتے گا؟“ میں نے کہا۔

”جنما دانا کہیں نہیں ہے۔ اُس نے اُٹھتے ہوئے کہا۔“ یہیں رکھا ہے اسی لئے  
تو مجھے آپ کا انتظار تھا۔“

وہ میخ کے پاس گیا۔ دہائی سے اخبار میں لپٹا ہوا ایک بندل اٹھا کر لایا۔ پھر مجھے  
ساتھ دالی ایک کیس بنیں میں نے گیا۔ بندل کر کوٹ دکھایا۔ جس کا کپڑا واقعی نہایت اچھا  
تھا۔ اور پُرانے پن کے بھی کہیں آثار نہ تھے۔ میں نے کوٹ پہنا تو وہ بولا۔ کہیں آپ  
نے تھا کے اس درزی کو اپنا ناپ تو نہیں بخوا دیا تھا۔“

کوٹ واقعی میرے بالکل فٹ تھا۔ اس کے ہدایے میں کیا نذر کروں؟“

وہ میرے کندھے کو تھپتھپا کر بولا۔ "دعا اور محبت" میں نے کہا۔ "نہیں، دعا اور محبت اپنی جگہ پر، مگر جان معاملہ کار و بار کا ہو ہاں یہ قصتے نہیں چلنے چاہئیں۔ اگر آپ مجھے یہ کوٹ دے رہے ہیں تو آپ کو اس کی قیمت لینا ہو گی۔"

"بہت اچھا" اُس نے بے انتہا سخیہ صورت بنائی اپنا ہاتھ پھیلا دیا۔ "لاتے یہ دس روپے لایتے؟"

"صرف دس روپے؟" میں نے بھرا تھا جگہ کیا۔

"تو کیا سور و پے؟" وہ سخیہ گی سے بول رہا تھا۔ اُسے صاحب جب دُہ شارک میکن کا کوٹ پارچے روپے میں جا سکتا ہے تو اس کے قو دس روپے لے کر میں آپ کو کوٹ رہا ہوں۔"

میں نے دس روپے کا بُوٹ اس کی طرف بڑھایا۔ تو میں نے محسوس کیا کہ اس کا پھیلا ہوا ہاتھ کا نپ رہا ہے۔

"آپ کا نپ کیوں رہے ہیں؟" میں نے بھتے پن سے کہہ ڈالا۔

"لاتے ہیں! اُس نے جیسے غصتے میں فوٹ میرے ہاتھ سے بھپٹ لیا اور کیجن سے باہر نکل گیا۔ کچھ درستک میں کیجن میں ہنکا بکا کھڑا رہا۔ میری سمجھو میں نہیں آتا تھا کہ باہر جا کر میں غفور کا سامنا کیسے کر دیں گا۔ میں نے اس کے سمجھنے کی قیمت ادا کر کے اس کے خلوص کو جیسے نیلام پر عرض کا دیا تھا۔

پر وہ اٹھا کر جھانکا تو میز خانی تھی اور میرا برتن سمیٹ رہا تھا۔

"غفور صاحب کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ تو چلے گئے۔" بیرا بولا۔ وہ مجھے کیجن میں سے نکلتا دیکھ کر حیران سا رہ گیا تھا۔

میں نے کہیں میں سے اپنا پرہا کوٹ اٹھایا اور بیرے سے ہل لافے کو گلد بیرا بولا۔ ”یہاں تو صاحب غفور صاحب کا حساب چلتا ہے۔ ان کا حکم ہے کہ جب وہ کسی کے ساتھ چاٹتے پہیں تو بل انہی کے نام ہو گا، تم ان کے دوستوں سے ہل دھول نہیں کرتے ہے۔“

میں ریستوران سے باہر آگیا۔ شام اندھیری ہو چکی تھی اور سڑک پر موڑ کارز کی روشنیوں کے فوارے چھوٹ رہتے تھے۔

پڑھی پڑھی ایک طرف پڑنے لگا۔ میرے سینے کی کیفیت، اٹھانی کے کوٹ کی اس حیب کی سی ہو رہی تھی، جس میں چھپی ہوئی پوتل بحوم کے دباو سے ٹوٹ چکی ہوا اور اس کی کہچیاں ایک دسرے کو کاٹ رہی ہوں اور بخ رہی ہوں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا۔ جیسے میں گھر جا کر آئندہ دمکھوں گا تو مجھے معلوم ہو گا کہ غفور کے چہرے کی تمام شکنیں میرے چہرے پر منتقل ہو چکی ہیں۔

چلتے چلتے میں سے اپنے پڑانے کوٹ کی اندر دلی جیب سے ٹوہ نکال کرتے کوٹ کی اندر دلی جیب میں ڈالنا چاہا تو میرے قدم رُک گئے اس جیب میں کاغذ کے چند پُرزوں تھے۔ بھلی کے ایک بھی کے نیچے جا کر میں نے ان پُرزوں کو دیکھا۔ اکثر پر بعض لوگوں کے پتے لکھے تھے۔ چند پُرزوں پر غالباً اور تظیری وغیرہ کے اشعار درج تھے۔ ایک پُرزو پر چھوٹے چھوٹے سودوں کا حساب لکھا تھا۔

یہ پُرزو جیب میں ڈال کر، میں بڑی تیزی سے واپس بجیب ریستوران میں آیا، میخرا نے مجھے ذرا چونک کر دیکھا اور بولا۔ ”فرمائیے!“

میں نے کہا۔ ”کیا آپ مجھے غفور صاحب کے گھر کا پتہ بتا سکتے ہیں؟“

”یہیں کہیں آس پاس ہی رہتے ہیں،“ دہ بولا۔ پھر اس نے شارک بیکن کے کوٹ دالے بیرے کو اشارے سے اپنے پاس بلا دیا اور اس سے کہا۔ ”صاحب کو

غفور صاحب کے گھر کا پتہ چاہئے۔“

بیرے نے مجھے بتایا کہ اسی رستوران کی عقبی گلی کے آخری سرے پر ایک میدان ہے جس میں بہت سی بھینیں بندھی ہوتی ہیں گی۔ اس میدان کے مغرب میں کوارٹروں کی ایک قطار ہے۔ اسی کے نمبر ۹ میں غفور صاحب رہتے ہیں۔ عقبی گلی بالکل تاریک تھی، اس نے جب میں میدان میں پہنچ گیا تو جب بھی یوں سیدھا چلتا رہا، جیسے گلی ابھی ختم نہیں ہوتی۔ اگر میں ایک بھین سے نہ مکرا جاتا تو شاید یونہی ناک کی سیدھی میں چلتا رہتا۔ ایک گولے نے میری رہنمائی کی اور مجھے ان کوارٹروں کے پاس پھوڑ آیا۔

مجھے نہ نمبر کوارٹر ڈھونڈنے کی ضرورت ہی بیش نہ آئی۔ کیونکہ گواں نے مجھے جہاں پھوڑا تھا، وہیں میرے کافوں میں غفور کی آواز آتی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ «اب میں اور کیا کرتا۔ اس سے زیادہ تو کوئی بے حیا اُوی بھی نہیں کر سکتا۔“

پھر ایک خاتون کی بھی بھیگی اداز سناتی دی۔ پچاس روپے کی پیسوں تم نے باقاعدہ تھیکر یوں میں وے ڈالی۔ اب ایک سو کا کوٹ دس روپی میں غارت کر آتے ہو تو تباہ میں لاہور سے کراچی جاؤں گی تو تمہارے یہ پندرہ روپے کیا مجھے دو ہری سکھر سے ادھر ہی نہیں پھوڑ دیں گے؟“

میں لیکر کر کوارٹر کے دروازے پر آگیا جس پر بوری کا پردہ لکھ رہا تھا۔ غفور بولا: «کیا تم چاہتی ہو کہ میں انارکلی میں جا کر پھیری دلوں کی طرح کوت انھائے گھومتا پھرتا۔ میری دوڑ میرے دوستوں سہک تھی اور دوستوں کے ساتھ سو دے نہیں ہوتے۔ تم کیا جاؤ۔ میں نے اُن سے یہ پندرہ روپے لے کر اپنے دل کے پندرہ ٹکڑے کرنے ہیں۔“

خاتون غاصی بلند آواز میں ردی ہوتی بولی۔ «اور وہاں کراچی میں جانے میری آمان

دم توڑ رہی ہوں گی یا دم توڑ بھکی ہوں گی؟  
 جواب میں غفور کچھ نہیں بولا۔ وہ شاید ہیوی کام سراپتے سینے سے لگاتے اُس کے  
 ہاتوں پر ہاتھ پھر رہا تھا۔ اپنے سر کو دلوں ہاتھوں میں دبانتے زمین پر بیٹھ گیا تھا۔  
 میں نے ایک بھکے کے ساتھ کوٹ اُتارا، اپنے جی چاہا۔ غفور کو پکاروں۔ کوٹ  
 اُس کے حوالے کر دوں اور اسے دلا سہ دوں۔ مگر موجودہ صورتِ حال میں غفور کئے  
 والا سے سے بڑی گالی اور کیا ہو سکتی تھی؟  
 پھر سوچا پر وہ اٹھا کر کوٹ اندر بھینکوں اور بھاگ جاؤں۔ مگر یہ اس سے جھی  
 بھٹاٹرے بھر مل تھا۔  
 اور غفور اور اس کی ہیونی کی باتوں کے بعد اس کو اڑ پر جو سنٹا ٹام سلطان ہو گیا تھا،  
 وہ بھجھے روندے ڈال رہا تھا۔

یخاں ایک بھجھے کو اڑوں کی قطار کے پرے سرے پر ایک آدمی نظر آیا۔ میں اس  
 کی طرف بھاگا تو وہ رُک گیا۔ قریب پہنچ کر میں نے اس سے پوچھا۔ اُپ اپنی کو اڑوں  
 میں رہتے ہیں؟  
 ”جی ہاں!“ وہ بولا۔ اُس نے ایک چادر اور ٹھرد کمی ہتھی جس میں اس کے چہرے  
 کا صرف ایک حصہ جھلک رہا تھا۔

”اُپ غفور صاحب کو جانتے ہیں؟“ میں نے دوسرا سوال پوچھا۔  
 ”جی ہاں!“ وہ بولا۔ ”کیا وہ اپنے کو اڑوں میں نہیں ہے؟“  
 میں تیری سے بولنے لگا۔ ”ویکھتے میں بہت دیر سے ان کا کو اڑ ڈھونڈ رہا  
 ہوں، اور مجھے ایک نہایت ضروری کام ہے۔ اگر اب غفور صاحب سے ملاقات ہرگز  
 نہ، تسلسلہ میں پڑ جائیں گے، اور مجھے دیر ہو جاتے گی۔ بات یہ ہے کہ کہ دُہ میرے  
 سایہ کوٹ بھول کر چلے آتے۔ بس یہ کوٹ ان تک پہنچانا ہے۔“

اُس نے بھروسے کوٹ لے لیا اور سنتے ہوتے بولا « دے دل گا، ابھی  
دے دیتا ہوں۔ میں خود سیران تھا کہ آج خوفزکر میری بھٹی پرانی شیردانی مانتنے کی کیا  
ضرورت پیش آگئی؟ اب معلوم ہوا کہ حضرت اپنا کوٹ ہی کنوائے پھرتے ہیں۔ عجب  
بھول بھلکڑا آدمی ہے۔»

---

## رضیہ

رضیہ کی جوانی تو جیسے اپنے اب اکی مت کے انتظار میں تھی۔ کمرے کم اس کی ماں سکو تو ایسا ہی محسوس ہوا۔ ماں سے فارغ ہونے کے بعد جب ماں بیٹی نے بڑے بھرے کی دری پیشی اور اس کے حاشیے کے ساتھ ساتھ چاروں طرف بیجوں کی تھوکوں کے دام و خونے پڑیں، تو نیکا یک رنیسیگم اپنی بیٹی کو دیکھتی رہ گئیں۔

اس وقت رضیہ نے ہفتے بھر کے چکٹ کپڑے پہن رکھتے تھے۔ لٹھے کی شوار کے پانچے بالکل سیاہ ہو رہے تھے۔ جبکہ کادا من صافی کی طرح میلا تھا اور بالوں نے اُجزہ مگر ہنگ کو غائب کر دیا تھا۔ وہ ایک دھجی کو جگو جگو کر دی کے حاشیے پر رکھ رہی تھی۔ ہر رگڑ کے ساتھ اس کی آستین کھنی ہنگ ہٹ جاتی تھی۔ اور میلے ہاتھوں کے چیچے اس کی کھلائی کا صندل چکٹ چکٹ جانا تھا۔ رنیسیگم کو سب سے پہلے انہی سدول بازوؤں نے رضیہ کی طرف متوجہ کیا۔ وہ بھی پرانے کوتے میں بھیگی ہوئی دھمجنی لئے بیٹھی تھی۔ جب پہلی بار رضیہ کے ہازد کا کونڈا پکا، وہ ذرا سی چونکی اور پھر رضیہ کی طرف یوں دیکھنے لگی جیسے اسے نئے مرے سے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہے۔ اچھا تو رضیہ بیٹی یہ قم ہو! ————— یہ ہوتم۔ تمادی جگکی ہوئی لائی انگوں کے گوشوں میں سے یہ جگنو سے کیسے جھانک رہتے ہیں! تمارے بال ایک دم اتنے

کیوں بڑھ آئے ہیں کہ فرش کو پھوڑ رہے ہیں! یہ کیسے نکھے نکھے بھنور ہیں جو تمہارے گاؤں میں بن بن کر ٹوٹ رہے ہیں۔ تمہارا جسم یوں بھرا بھرا سا کیوں ملگتا ہے جیسے تم نے جھپر پینے کے بجائے مژہ رکھا ہے اور بیٹھی تھا میں جلد چمک کیوں رہی ہے؟ چمک نہیں رہی، تو تمہارے جھپر کے پیچے یہ آگ ہی کیسی جل رہی ہے؟ ٹھیک ہے، اب تم سترہ سال کی ہو رہی ہو اور پڑوس میں سترہ سال کی عودہ تین بچوں کی ماں بن چکی ہے؛ منگو بیٹی! ابھی کل تک تو تم گردیاں کھیل رہی تھیں اور ابھی تو ہم تمہارے رشتے کے بارے میں یوں رد از دی میں سوچتے تھے، جیسے ابھی کیا ہے۔ ابھی تو چار برس پڑے ہیں، کونی ڈھنگ کا رشتہ اس سے پہلے مل گیا تو ٹھیک ہے ورنہ ایسی جلدی کیا ہے؟ پہنچی، اب تو مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ اگر میمنے دو میمنے کے اندر تمہارے ہاتھ پیسے نہ ہوئے تو اپنی ہی آگ میں جلس جائیں گے، یہ ایکا یکی تھیں کیا ہو گیا رضیہ بیٹی! — یعنی جب باپ کی موت بیٹی کی جوانی کا استھان نہیں کرتی تو بیٹی کی جوانی کو باپ کی موت کیوں روکے؟ اور پھر جوانی اپنی رضی کی چیز تو نہیں ہے۔ جوانی تو آجاتی ہے، یہ تو ٹوٹ پڑتی ہے جوانی کو بہر حال آنا ہے جیسے گندم کی بآلی کو کپک کر آخر کار، بہر حال سنہری ہونا ہے شوہر کی موت کی طرح بیٹی کی جوانی بھی یوہ کا نصیب ہے۔

”میرے نصیب!“ ریسے میگم ماتھے پر چنان سے ماہدا اکر کر اب اب کر دنے لگی اور رضیہ دھمکی کو پھینک کر ماں کی طرف لپکی۔ ردتی ہوئی بیٹی نے ردتی ہوئی ماں کو اپنے بازوں میں سے لیا اور پکاہ پکاہ کر کہنے لگی۔ ”مت روئے امی۔ اس طرح تو آپ کی بیاناتی بھی آنسوؤں میں بہ جائے گی امی۔“

ردتی ہوئی ماں چیسے سوچ میں پڑ گئی، بیٹی کے بازو کرنے لمبے تھے کہ انہوں نے پوری ماں کا احاطہ کر دیا تھا۔ بیٹی کے جسم میں کتنی گرمی تھی اور اس کی سانسوں میں کمیش شعلے کی سی پٹ تھی۔ ماں نے بیٹی کو ذرا دیر کے لئے یوں غور سے دیکھا، جیسے پوچھ رہی

ہے۔ ”بیٹی تم اب تک کہاں تھیں؟“  
 مانا کہ بیٹی کے پیدا ہوتے ہی ماں کے ذہن میں رشتوں کی گریں بندھنے کھلنے لگتی  
 ہیں اور رئیسہ بیگم نے بھی رضیہ کے لئے رشتوں کا ایک پورا دستہ تیار کر کھاتا۔ مگر مشکل  
 یہ تھی کہ اب تک وہ سچھ جل رہی تھی۔ شوہر کے بازو کا سارا لے کر سچھ سچھ پلتے  
 ہی میں مزا آتا ہے۔ وہ سوچتی تھی۔ حامد بڑا نہیں ہے۔ مگر چار سو کی تجوہ بھی کوئی تجوہ  
 ہے، چار سو میں تو رضیہ کا ایک جوڑا بھی نہیں آتے۔ ٹکڑے سکورا بڑا وہ جیسا جوان ہے مگر  
 صرف دجہت کوئی کہاں تکہ سمجھا چاہتے۔ اور بھر رغیبہ کیا کم وجہہ ہے! اُنہیں اس  
 کی سی آنکھیں کوئی دکھادے تو اللہ تھم! اپنی آنکھیں نکال کر اس کے ہاتھ میں لھما دوں۔  
 ”رسو“ رضیہ کے ابا کہا کرتے تھے۔ ”یہ تمہاری بیٹی اپنی آنکھیں کہاں سے لائی ہے؟  
 میری آنکھیں تو ماشرا اللہ پیش تھا ری آنکھوں کو زیادہ تھے: زیادہ! لا ماشرا اللہ کہا جائے  
 ہے۔ مگر وہ رعنوکی آنکھیں!“ اور بھر رضیہ نے تو بھی ایف اے ہی پاس کیا تھا۔ بی اے  
 سک پہنچے گی تو رشتے آپ! آپ! زخمی کبوتروں کی طرح پھر پھر اکر اس کے قدموں میں  
 ڈھیر ہونے لگیں گے۔

اور اب رئیسہ بیگم نے شہر کے ان سب لڑکوں کی ماڈن کے قدموں میں زخمی کہوتہ  
 کی طرح پھر پھر اکر ڈھیر ہو جانا شروع کیا جو رضیہ کے ابا کی نندگی میں رئیسہ بیگم کے ذہن میں  
 بھرتی کے امیدواروں کی طرح صفت باندھے کھڑے رہتے تھے۔ مگر کسی نے یہ بھی تو  
 نہ پوچھا کہ رغیبہ کی جمیعت کیسی ہے۔ سب نے رئیسہ بیگم کو بیوہ کی حیثیت سے دیکھا۔ یہ  
 کہسی نے نہ دیکھا کہ یہاں میں اپنی بھی ہوتی ہیں اور مایہ اپنی بیٹیوں کے رشتوں کی ڈالیاں  
 سجا کر نہیں پھر اکرتیں۔ یہ کام تو بیٹوں کی ماڈن کا ہوتا ہے اور یہاں تو بیٹوں دالیوں کا  
 طرزِ عمل کچھ ایسا ہو رہا تھا چیزے۔ رئیسہ بیگم کے شوہر کے ساتھ اس کی بیٹی بھی مر گئی ہے۔  
 ”ہا۔ بھی رئیسہ بیگم؟“ سب کہتیں ہیں۔ اسی لئے تو بڑی بوڑھیاں ہر فماز کے بعد دھماگتی

تھیں کہ اے اُمَدِیاں۔ جس اس جہان سے ہمارے سرماج سے پہلے اُٹھا لیجو ہمیں دُہ  
پھول نہ بننے دیکو۔ جس کے گرد مبلىں نہیں منڈلاتیں بلکہ جن پر چڑیاں۔ میں کہ جاتی ہیں۔  
ہر گھر سے دُہ یہ کہتی ہوئی اُٹھی۔ اب چلوں بہناں۔ بھائیں بھائیں کرتے ہوتے  
گھر میں رضیہ بیٹی گھبراہی ہوگی۔“

صرف ایک گھر میں اُس کی یہ ترکیب کامیاب رہی۔

”ارے میظو بھی رئیس بیگم، کہاں چلیں؟ اسی بھی کیا جلدی جیسے یہ بتانے آئی ہو کہ  
ہم جا رہے ہیں۔“

رئیسہ بیگم نے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ اُٹھتے ہوئے کہا۔ ”بس چلوں بہناں۔  
وہاں اس دیرانے میں جسے کبھی ”فرحت کدہ“ کہتے تھے، میری رضیہ بیٹی گھبراہی ہو گئی۔“  
”اری ہاں دہ رضیہ بیٹی،“ باخوبی۔ ”اللہ رکھتے وہ تو اب پوری سیانی ہو گئی میں  
نے تو یہ کوئی سال بھر پہلے اسے شرف النساء کے گھر میں دیکھا تھا۔ اس کی بیٹی کی  
شادی پر۔ سب لوگ یا لوں بیٹھی ہوئی عطا یہ کو چھپڑ رہے تھے۔ جب رضیہ بیٹی دردانے  
پر فودا رہوئی، اور اللہ قسم رئیسہ بیگم، خوشابدی کی بات نہیں، سارا کمرہ یوں سننا کر رہا گیا  
کہ بس، سختے رہ گئے سب کے سب۔ رضیہ بھی گھبراٹی کہ یہ ایکا ایکی سب کو کیا ہو گیا۔  
اس معصومہ کو کیا خبر کہ ہم سب اللہ کی قدرت دیکھ رہے ہیں اور حیران ہو رہے ہیں کہ  
اچھا تو ایسی صورتیں بھی ہوئی ہیں کہ دیکھو تو دیکھتے رہ جاؤ۔ پلاک تک نہ جھپک سکو۔  
جھپکو تو سمجھو کوئی گناہ کیا ہے، خدا نصیب کرے۔ کیسی ہے دہ؟ اب اگلی موت نے  
تو اسے سچوڑ لیا ہو گا!“

گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ اُٹھتی ہوئی رئیسہ بیگم، اب آہستہ آہستہ میظو  
چکی تھی۔ بولی۔ ”موم کی مردم کی مردم ہو رہی ہے میری جان۔“

”اب تو اس کی ساری نکریں تمہی کو کرنا ہوں گی،“ باخوبی۔

”ہاں بہتائی اور کون ہے اس کا؟“ رئیسہ بیگم اب چکردا مار کر بیٹھ چکی تھی۔  
”بس صرف اتنا سا کام باقی ہے کہ بات کہیں طے پا جاتے۔ جہنر تو اس کا دو برس  
پہلے سے تیار رکھا ہے۔ آدھی درجن نیکیوں سے لے کر افشاں اور سیندوں تک۔ بس اتنا سا  
ہے کہ کہیں نصیر بجا گیں۔“

”نصیر بیوں نے تو اس نمانے میں بھنگ پی رکھتی ہے بہن۔“  
— بافو بولی۔ ”یہ ہمارے پڑوس میں عاطفہ کو دیکھو، باپ کی اتنی بڑی دلکاش ہے کہ  
چاہو تو ٹانگے سیست اندر چلی جاؤ۔ پر پانچ سال تک ماں باپ کاں درجے بیٹھنے رہے کہ  
دروازے پر کوئی دشک دے تو اٹھیں۔ جبکہ کوئی راستہ بھول کر بھی نہ آیا تو بیٹی کو اٹھا کر  
ایک اسکول ماسٹر کے پلے بازہ دیا اور اب اس کے گھروندے میں بیٹی عہدوں پنج پیدا  
کر رہی ہے۔“

”وہ لڑکی تو صورت کی بھی اچھی تھی؛ رئیسہ بیگم ڈر کے مارے بول دی کہ کہیں بات  
ختم نہ ہو جاتے۔“

”صرف اچھی؟“ بازو نے کہا۔ ”اچھی غاصی تھی۔“  
”تو پھر تم نے اپنے انور کے لئے کیوں نہ پوچھا؟“ رئیسہ بیگم نے ٹوہ لگانا پاہی۔  
اٹھا بافو اس کی بات کی ٹوہ تک پہنچ گئی اور اوہ حیر پہنے کے باوجود مٹک کر بولی۔  
”اس نے تو درجن لڑکیوں میں سے ایک کو چن بھی لیا ہے۔ اس کے ایا جس سے واپس  
آجائیں تو شاید اگلے چاند کی چودھویں تک...“

”مبارک ہوئے“ کے انفاظ رئیسہ بیگم نے ”تف ہو“ کے لہجے میں ادا کئے اور لکھنؤں  
پر ہاتھ رکھے بغیر انہوں کھڑی ہوئی۔ ”اٹھد کا شکر ہے۔ اٹھد پھولے پھلنے۔“

”آمین۔“ بافو بولی۔ ”بس چلیں؟“

”ہاں بہتائی چلوں۔“

”خداء حافظہ“

”خداء حافظہ!“ رئیسہ بیگم نے کہا اور ملتے بھر سوچتی آئی کہ تھیک ہی تو گما ہے  
بانو نے اسکی بخش اب ہمارا خدا ہی حافظہ ہے۔

برآمدے میں رضیہ پڑانا بھم کھولے بھٹھی تھی ہے اُنی، اس نے کہا ہے یہ جو لاہور والی  
حالہ زیخا ہیں۔ جو آپ سے لپٹی ہوئی کھڑی ہیں۔ یہ اچھی سیلی میں آپ کی کہ ہمارے آبا  
کا انتقال ہو گیا اور انہوں نے ہمدردی کا ایک کارڈ بھی زکھوا۔

”تو ہم نے کہاں لکھا تھا اُسے“ رئیسہ بیگم بولی، اور پھر جیسے اُسے کچھ بیاد آگیا، اُسے  
پڑھتا تو خط کیا لکھتی خود پہنچتی خود نہ اسکتی تو اپنے سیم کو بسج دیتی۔ پڑھنے کوئی بتا آجھی تو،  
”اکبر ماہوں نے لاہور میں سب کو تو بتایا تھا، رضیہ بولی“ اس روذگرہ نہیں ہے  
تھے کہ اوہ را نہیں تارہ، ادھر دہ کارے کہ سب جانتے دلوں کے ہاں اعلان دے آئے۔  
”زیخا کا نام نہیں لیا تھا اُس نے“ رئیسہ بیگم بولی۔ میں نے سب کے نام پُڑھے  
تھے مگر زیخا کا نام کیسی نہیں آیا۔“

”آپ نے بھی تو بیاد نہ دلا یا۔“ رضیہ نے کہا۔

”ہاں میرے اجوٹے ذہن سے بھی اتر گیا۔ برسوں ہو گئے دیکھے ہوتے۔ اس وقت  
سیم کی میں بھیگ رہی تھیں۔ ایف اے میں پڑھتا تھا۔ اب ایم اے میں قو مزدہ ہو گا۔“  
.... ذرا سار کر بولی۔ بیٹی ذرا کاغذ قلم تو اٹھا لاؤ۔ اکبر کو کھو دوں کہ وہ زیخا کو جا کر  
بتکے۔ میں تو زیخا کا پر تھی بھول گئی ہوں۔“

خط لکھ کر اُس نے بر قدر اور ہا اور لگی کئے نجڑ پر لیٹر کس میں ڈال آئی۔

قمرے روذہ دستک ہوئی۔ رضیہ نے دروازہ کھولا، تو وہیں سے چلانی۔

”اے اُنی، یہ تو اکبر ماہوں ہیں، پھر وہ ماہوں کو تیچھے چھوڑ کر بھاگتی ہوئی آئی، اور کمرے  
میں جھاٹک کر بولی۔ اکبر ماہوں آتے ہیں اُنی۔“

مگر رئیس بیگم نے کسی قسم کے تعجب کا اظہار نہیں کیا۔ بڑے سکون سے بولی۔ «ہاں آتے ہیں تو ٹھیک ہے۔ میں نہیں تو بلایا تھا۔»  
 چکیوں بلایا تھا؟ اکبر کمرے میں اگر بولا۔ بلایا تھا تو ساتھ ہی یہ بھی تو مکھ دستیں کہ  
 کیوں بلارہی ہوا۔ اب تم دونوں کو جنتا جائیں ادا کیجو کر جان میں جان آتی ہے۔ ورنہ جانے  
 کیسے کیسے بھیا ہک نفیت آنکھوں کے سامنے آتے رہے۔ یہ «فوراً پہنچو» کے الفاظ لگتے  
 تو الفاظ ہیں مگر صل میں پستول کی گویاں ہیں، اے کے کلیجہ ہلا دیا، مگر بھر کا، تو یہ ہے؟ وہ  
 سر کو دونوں ہاتھوں میں داکر پنگ پر بیٹھ گیا۔

«بلایا ہے تو یو نہیں بلایا ہے۔ رئیس بیگم بولی۔ کوئی ات ہے جو بلایا ہے؟  
 کیا بات ہے؟»

«اب تھیں نہیں بلااؤں گی تو اور کے بلااؤں گی؟»

«ٹھیک ہے۔ میں یہ کب کہتا ہوں، پر باجی۔ یہ بھی تو بتاؤ کو خیریت تو ہے نا۔»

«ہاں ہاں دیے سب خیریت ہے۔»

تو پھر ادھر آؤ۔ دونوں یہاں میرے پاس بیٹھ جاؤ۔ میں تو تم لوگوں سے ملاہی نہیں:  
 ذرا ویرادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اکبر نے پوچھا۔ «بھی باجی۔ یہ بھی تو بتاؤ کہ مجھے  
 بلایا کیوں تھا۔ تم نے تو سویں پر لٹکا رکھا ہے مجھے۔»

«بتاتی ہوں، بتاتی ہوں۔» رئیس بیگم نے رضیہ کی طرف کوچھ اس طرح دیکھتے ہوئے  
 کہا کہ وہ اٹھ کھڑی ہوتی جیسے اُتی نے اسے کمرے سے باہر نکل جانے کا حکم دے دیا ہے  
 «تم کہاں چلیں رضوی،» اکبر نے پوچھا۔  
 «ماموں جان، میں ذرا ادھر...»

مجانے دو۔ رئیس بیگم فوراً بول اٹھی۔ «جاوہیڈی تم ماموں کے لئے چاہے تیکر وہ۔»  
 رضیہ چلی گئی تو اس نے اکبر سے کہا۔ دیکھو اکبر۔ رضیہ کے آبا کے مرنسے کے بعد مجھے

دو کام کرنے ہیں۔ ایک تو رضیہ کے لئے بیاہ کا انتظام کرنا ہے اور دوسرے اپنی مت  
کا انتظار کرنا ہے۔“

”باجی۔۔۔۔۔“

”مسنونہ۔ بجھا ایسی نجھڑی ہیو ایس جن کی کوئی زینہ اولاد نہیں ہوتی، یہی تو کتنی ہیں، اور  
کیا کرتی ہیں اور کہہ ہی کیا سکتی ہیں؟ تو بات یہ ہے کہ رضیہ کے رشتے کا انتظام کرنا ہے  
جلدی سے۔ اتنی دیر نہ گئے کہ بیٹی ان سے اس کی طبیعت کا حال بھی پوچھے تو ایسا لگے  
جیسے اپنے بیاہ کی باد دہائی کراہی ہے۔“

”یہ قم تھے تباہی ہو باجی؟“ اکبر نے بہن کا ہاتھ پکڑ دیا۔ میں بھی تو خسانت اور دردانہ  
کا باپ ہوں، اور وہ قورضیہ سے پانچ پانچ سات سات سال بڑی ہیں۔“

”پھر؟“

”پھر کہ ڈرامہ مسئلہ ہے، مجھے دیکھو، لاہور میں رہتا ہوں۔ اتنا ڈرامہ کاروبار ہے۔ مجھے  
ہے نہ موڑ رہے، سب کچھ ہے۔ مگر داماد نہیں ہے۔ سب سکتے ہیں لڑکیاں زیادہ پڑھی لکھی  
نہیں ہیں۔“

”پورضیہ نے تو ایف اے پاس کر دیا ہے۔“

”ٹھیک ہے پورہ سیاکوٹ میں رہتی ہے نا۔ لاہور کراچی میں ہوتی تو ایک  
دن بھی نہ لگتا۔“

”اقو میں لاہور میں اٹھاؤں؟ میں تو اس کام کے لئے دنیا کے آخری گنارتے تک  
جانے کو تیار ہوں۔“

”آجا تو،“ اکبر نے کہا۔

”سنو،“ رئیسہ ہمگم کا لمحہ اچانک ڈل گیا۔ ”ایک رشتہ ہے۔“

”لکھاں؟“ اکبر دم دم بخوبی سارہ گیا۔

”لاہور میں!“

”لاہور میں؟“ اکبر نے یوں پوچھا، جیسے لاہور میں رشتے کی موجودگی ناممکنات میں شامل ہے۔

”ہاں ہاں۔ میری وہ سیلی ہے نا۔ تم تو اسے جانتے ہو، زینجا۔“

”ہاں جانتا ہوں۔“

”اس کا بیٹا سلیم۔“ رئیسہ بیگم نے مسکر اکر کہا۔

”ارسے ہاں... ہاں۔“ اکبر بھی ذرا سا مسکرا یا۔

اب رئیسہ بیگم الہمنان کے ساتھ آہستہ آہستہ بولنے لگی۔ پچھے اتنے ایسا بھی نہیں ہیں کہ خڑکے کرنے لگیں۔ سیدھا سادا اور میانہ گھرانہ ہے۔ پھر زینجا کے ساتھ میرا تناپڑانا تعلق ہے کہ مجال ہے جو وہ انکار کر جائے۔ تمیں اس لئے بلا یا ہے کہ میں کہاں اس بڑھاپے میں ماری ماری پھروں گی۔ اگر تمارے ساتھ چلی بھی جاؤں تو رضیہ کو ایکلے کیسے چھوڑوں اسے بھی لے جاؤں تو یہ باتیں کیسے سنوں کہ رشتے کی خاطر بھی کو ساتھ مانے لئے پھرتی ہے۔ نافرش کے لئے۔ سو تم یوں کرو کہ واپس جا کر اٹیشن سے سیدھے زینجا کے گھر پہنچو اور اس سے سیدھی بات کر دو۔ کہہ دو رئیسہ نے یونہی کہا تھا۔“

”یہی بات باجی اتم خط میں بھی تو کھو سکتی تھیں،“ اکبر نے شکایت کی۔

”نہیں، اکبر بیارے۔ ایسی باتیں خطاوں میں لکھنے کے زمانے گزر گئے۔ آج کل ڈاک کا کیا اعتبار۔ غلطی سے یہ خطا اڑوس پڑوس والوں کے ہاتھ لگ جائے، تو اشتہار ہنا پھرے۔“ لمحہ پھر خاموشی رہی۔ پھر رئیسہ بیگم بولی۔ ”پھر اب کیا ارادہ ہے؟“ اکبر بولا۔ ”ٹھیک ہے۔ جامآ ہوں۔ بڑی اچھی بات ہے۔ بڑی مناسب بات ہے۔“

چاہئے پی کر اکبر واپس چلا گیا۔ اور ادھرات گئے تہک ماں۔ بیٹی ایک دُم برے

سے یوں جھینپی جھینپی پھرتی رہیں جیسے کوئی بات کریں گی تو کچھ ٹوٹ ڈال جائے گا۔  
جیاگ رہی ہو میری رضو۔ آخر تیسہ بیگم نے اس تخلیف دخانوشی کو توڑا۔  
”ماں امی“ رضیہ بولی۔ ”پڑھ رہی ہوں۔“  
”میں آج بہت خوش ہوں۔“ رضیہ بیگم نے راز فاش کیا۔  
”شکر ہے“ رضیہ بولی۔

پھر دخانوشی چھاگتی کیونکہ رضیہ بیگم کو بات آگے بڑھانے کے لئے کوئی نئی بات نہ  
سوچی اور غیرہ بات آگے بڑھانا ہی نہیں چاہتی تھی۔  
اسی کیفیت میں ایک دن گزرا۔ ایک ہفتہ گزرا۔ ایک ہفتہ گزرا۔ ایک ہفتہ گزرا۔ اور آخر ایک  
روز رضیہ بیگم نے اکبر کے نام ایک لہاظت لکھا۔ بر قدر اڑھا اور بگلی کے نکوپر لیٹر بس میں  
ڈال آئی۔

تین چار دن کے بعد اسکے نے وٹک دی، رضیہ در دارے کی طرف پکی اور  
خط لاکر مل کے جوائے کر دیا۔

”اکبر کا معلوم ہوتا ہے؟“ رضیہ بیگم نے کہا۔  
”ماں!“ رضیہ بولی۔ ”انہی کا لگتا ہے۔“

رضیہ بیگم کچھ دیر تک لفافے کو اٹھنی پڑتی رہی جیسے سوچ رہی ہے کہ کس طرف  
سے چاک کر دی اور اگر چاک کر دی تو کیس خطا پر عبارت بولنے نہ گے۔

رضیہ پچکے سے کمرے میں سے نکل آئی۔

رضیہ بیگم اسے جانا دیکھ کر مسکرائی۔ لفافہ چاک کیا۔ اور ہاظت پڑھنے تک یہ سکرہت  
اس کے ہونٹوں سے چھٹی رہی۔ پھر بیکا ایک پڑاع کی طرح بچ گئی۔ پھر وہ ایک غیر انسانی  
چیخ مار کر دھیلوں کی طرح کمرے سے باہر نکلی۔ ادھر سے رضیہ دوڑی آئی اور رضیہ بیگم  
نے خط کو اس کے ہاتھ میں ٹھوں کر پوری قوت سے کھا۔ اسے پڑھو۔ اونچا اونچا پڑھو۔

سناؤ۔ سارے محلے کو سناؤ، ساری دنیا کو سناؤ۔“  
”انی!“ رضیہ نے اس سے پہنچتے ہوئے کہا۔

مگر تیس بیکم نے رضیہ کو اپنے آپ سے جیسے فیض کر الگ کر دیا اور اسے ڈپٹ  
کر دیا۔ ”پڑھو؟“

رضیہ ہو لے ہوئے ڈھنٹنے لگی۔ اس کے اکبر اموں نے اپنی ”پیاری باجی“ کو  
اطلاع دی تھی کہ ایک عجیب اتفاق ہو گیا۔ ”میں تمیں خط لکھتا تو کیسے لکھتا۔ ہتوا یہ کہ میں  
زینخابن سے ابھی ادھر ادھر کی باتیں ہی کر رہا تھا کہ اُن نے پھٹ سے پہنے سیل کرنے  
میری رُخسانہ کا رشتہ پوچھ لیا۔ اُب میں حیران کر کیا کروں۔ پھر سوچا کہ رُخسانہ بھی تو تمہاری  
بیٹی ہے۔ اور پھر رضیہ سے سات سال ہڑی ہے، آج رُخسانہ کے نصیب جا گے ہیں،  
تو کمل رضیہ کے بھی عنزو رجایس گے۔ سو بات دیں طے پاگئی۔ ۱۵ ارجب نکاح کی نایخ  
مقرر ہوتی ہے۔ تم ہفتہ عشرہ پہلے پہنچ جانا۔ رضیہ کو بھی ساتھ لیتی آنا۔ یہاں دو قمی رُخ کے  
میری فنظر میں ہیں۔ — ”دُعا کا طالب اکبر“

---

## ہم میگ

وہ تھا تو مخفی سا آدمی، مگر وہ بہت بڑا آدمی تھا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، کہ جو آدمی کروڑوں اور اربوں روپے کا مالک ہے اور جس کے سامنے حکومت کے علاوہ مخفیہ عکون کی حکومتیں بھی آنکھیں جھکاتے دوزاویں میلی ترقی ہیں، وہ آئندی خفیت سی مخفی عکون ہے کہ، تیلی پر رکھ کر پھونکا، اور تو فضا ہی میں سعلق رہ جائے اور زمین کی کشش ثقل کہتے کہ پانچ منٹ کے لئے تو ضرور ناکام ہو جائے۔ کہتے ہیں چینی اس کے پاؤں کے نیچے آکر بھی چلتی رہتی تھی۔

یہ سب تغیر مبالغہ کی باتیں ہیں۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ وہ بڑا آدمی بہت چھوٹا سا تھا۔ کسی نہایت دُور انڈیش اور جہانیہ سیکرٹری نے اسے ٹری ٹری موچھیں رکھ لینے کا مشورہ دیا تھا، اور نہ اگر اس کی موچھیں نہ ہوتیں تو اس کے بڑھاپے میں بھی اجنبی لوگ اسے ”برخوردار“ کہہ بیٹھتے۔ یہ ٹھیک ہے کہ موچھوں اس کے جسم کا ایک حصہ معلوم نہیں ہوتی تھی وہ پھنانوں کے کندھے پر رکھتی ہوئی چادر کی طرح بالکل فاتحہ چیز تھی، اور ایسا کہنا تھا کہ اسے چھینک آئی تو موچھیں پھر کی کی طرح چکرا کر گریں گی۔ لیکن موچھوں نے اس کی شخصیت کا بھرم ضرور رکھ دیا تھا۔ بدھی عورت کے ہنٹوں پر اگر لپ اسٹک بڑی معلوم ہوتی ہے تو ہوتی رہے۔ بڑھیا کے اس اطمینان کی قیمت کون ادا کر سکتا ہے کہ لوگوں کی فطری اس کے ہنٹوں کی

سیاہی کاں نہیں پہنچ سکتیں۔

اس بڑے آدمی نے اب تک شادی نہیں کی تھی۔ چون یہیں بر س کے تو عمومی معمولی بڑے آدمی بھی ایک چھوڑ دو تین تین شادیاں کرچے ہوتے ہیں۔ مگر یہ بہت بڑا آدمی اپنے تک اور پڑی مکون میں اپنے کارخانوں، دکانوں، بخنوں، بیمہ کمپنیوں، فلامروں اور زمینوں کے اختلاط میں مجھ پر یوں ڈوبا رہتا تھا کہ اپنی ماں کے سوا کسی عورت کو پہچانتا ہی نہ تھا۔ ٹری ٹری ضیافتوں میں بھی وہ خورتوں کی طرف کچھ ایسی نظر وں سے دیکھتا تھا، جیسے ہوٹل میں بیٹھا بیرے کی طرف دیکھ رہا ہے۔ لوگ اس سے اپنی بیویوں کے سہارے اپنی بیٹیوں کا تعارف کرتے تو وہ "آپ سے مل کر خوشی ہوئی" کے الفاظ یوں ادا کرتا جیسے کہ رہا ہے۔ آپ ان کی بیٹی ہوتی ہیں تو ہوتی پھریں بس ٹھیک ہے۔ ہو گیا تعارف۔ اب ذرا ایک طرف ہست جاتے ہیں اور میرا مستہ چھوڑ دیجتے ہیں۔

"شادی تو بیٹا، ایک روز کرنا ہی ہو گی۔" بیکم بہرام ہر دوسرے تیر سے میں یاد دلانی کا فرض ادا کرتیں۔

اور ہم بیگ غصتے میں آکر ہمیشہ یہی کہتا ہیں "آخر ضرورت ہی کیا ہے؟" بیکم بہرام آنے والے دو تین میں نے شادی کی ضرورت کو ہندب الفاظ کا باس پہنانے کی کوشش میں گواردیتیں۔ مگر جب بیٹے سے بات کرتیں تو ان کی سادی صورتی "وہ تو کرنا ہی ہو گا بیٹا۔" میں سمجھت آتیں اور ظاہر ہے کہ اس تحریز کا جواب ہم بیگ کے ہاں موجود تھا۔

پھر بیکا ایک ملکت میں افواہ پھیل گئی کہ ہم بیگ کی شادی کے لئے ایک روکی کی تلاش ہے۔ یہ تاثر دراصل یوں پیدا ہوا کہ اپنے چھاڑاں بھائی سے ہم بیگ کی کسی بات پر لڑائی ہو گئی اور جب شام کو وہ دفتر سے گھر آیا اور ماں کو سارا حال سنایا تو وہ بولی یہ "اگر تم نے شانی نہ کی بیٹا، تو یہی کہنے تھا رے وارث ہوں گے۔"

بیگم بہرام کے فہریں میں یہ بات پسے بھی نہ زار بار آئی تھی۔ مگر اسے علوم تھا کہ یہ  
بیکم ایجنت کا سا طرزِ استدلال ہے، اس سے موت کا پہلو نکلتا ہے اور ہم بیگ اگر دنیا  
میں کسی حادثت سے ڈرتا تھا تو وہ صرف موت تھی۔

آج بیگم بہرام کی زبان سے یہ بات بغیر کسی پیشگی تیاری کے نکل گئی اور ہم بیگ جو  
شادی کے ذکر کے بعد غصتے ہیں شام کا کھانا سک نہیں کھاتا تھا، اس روز ماں کی بات  
سننے ہی جیسے سن لئے میں آگیا۔

اس وقت بغل کے کمرے میں کوئی خادمہ موجود تھی۔ اُس نے ہم بیگ کی یہ حالت  
دیکھی تو وہ بھی سنائے میں آگئی۔ آج شادی کے ذکر پر، ہم بیگ نے نہ تو شادی کی ضرورت  
کے بارے میں کچھ پوچھا تھا، نہ اُس نے پھوٹ کی طرح پاؤں پٹختے تھے اور نہ اس نے لٹٹے لٹٹے  
نقدوں میں ماں سے کوئی احتجاج کیا تھا۔ آخر ضرورت ہی کیا ہے؟ ”دہ طیش میں اگر پھوٹ  
کی طرح ہوتا تھا ہوتے ماں سے احتجاج کرتا تھا“ کہہ جو دیا کہ ہم نہیں کریں گے شادی۔  
ہم کیوں کوئی شادی؟ ہمیں ضرورت ہی کیا ہے شادی کی؟ ”وغیرہ وغیرہ۔ مگر آج جیسے  
ہم بیگ کی زبان پتھرا گئی تھی، اور وہ فرش سے ماں اور ماں سے فرش کو دیکھتا ہوا نہیں  
نہیں تھا تھا آدموں سے دوسرے کمرے میں چلا گیا تھا۔ جہاں سے خادمہ تیسرے کمرے میں پلی آئی تھی،  
خادمہ نے یہ بات باورچی تک پہنچائی تو وہ بھی سن لئے میں آگیا۔ پھر وہ مسکانے لگا  
اور یہاں ایک مٹھیاں بھلکنے کر رہیا تھا اور چی کی طرف بھاگا۔

ہیڈہ اور چی پر بھی سنائے کا ایک تختہ سا دوڑگڑا، اور پھر جب وہ صبح کو بازار  
گیا تو شام تک ستر کے ایک مرے سے دوسرے مرے تک سناٹا کئی باراً، اور  
بچپکا تھا۔

بیگم بہرام کے بدے بدے تیوروں نے بھی اس افواہ کے اتھر مضبوط کئے۔  
اب وہ بڑی بڑی خسیافتوں میں جوان لڑکیوں کو ختمدوں کی طرح گھورتی تھی اور جب اس

کی ہم عمر بیگات اس سے پوچھتی تھیں کہ "بیگم بہرام کس سوچ میں مگن ہیں؟ تو وہ جواب دیتی تھی "اپنا فرض پورا کر رہی ہوں۔"

اب ہم بیگ کے دفتر میں مانپٹ لوکیاں لے کے اس سے شرمنے لگی تھیں اور وہ اس کی طرف یوں دیکھتی تھیں جیسے وہ انہی کی طرف دیکھ رہا ہے۔

بیگم بہرام اب بیٹے کے ساتھ خاصی بے خوبی سے شادی کا ذکر کرنے لگی تھی۔

لیکن جس طرح پہلے دس بارہ برس میں اسے "کرنا ہی ہوگی" کا جواب "ضروری ہی کیا ہے؟" سے ملا تھا۔ اسی طرح ہم بیگ اب اس کی ہر تاکید کے چاہب میں صرف اتنا کہتا ہے "یہ تو آماں تمہارا کام ہے۔ میرا کام نہیں۔"

اور بیگم بہرام دو تین میئنے کے لئے اسی سوچ میں ڈوب جاتی کہ ہم بیگ کو کس طرح بہتر طریقے سے سمجھایا جائے کہ یہ دراصل اسی کا کام ہے۔

تھوڑے سے عرصے کے بعد ہم بیگ کی دہن کی یہ تلاش اخباروں کے ساتھ پڑھ گئی دہان سے نکل کر غیر مالک میں جا پہنچی۔ موئیخوں والے کروڑ پتی "کی ہر خوبی سے ہم بیگ کی بڑی بڑی تصویریں چھپیں۔ اس کی زندگی کے حالات اور اس کی امارت کے اندازے شائع ہوتے اور ایک اخبار نے تو یہ نجہر بھی درج کر دی کہ موئیخوں والا کروڑ پتی اپنی رفیقة حیات کی جستجو میں عنقریب قاہرہ اور پرس کے شبانہ کلبوں میں ہالی ڈکے نگارخانوں اور میں یونیورس اور لہ کے نشانی مقابلوں کا بچشم خود مشاہدہ کرنے کے لئے اپنے ہی طیارہ میں ساری دنیا کا سفر اختیار کرنے والا ہے۔

انہی دنوں ہم بیگ نے ایک لمحہ منکرت میں اپنے دیمع کار و بار کے معانے کا پروگرام بنایا۔ اس حکمت کی حکومت شدید مالی پریشانیوں میں بدلائی۔ اس لئے جب اسے ہم بیگ کے ارادے کا علم پتو ا تو فوراً ایک دعوت داع دی اور ایک

بہت بڑے صنعت کار اور مرماں دار کا یہ تجی دو رہشا ہا نہ حیثیت اختیار کر گیا۔  
 بیگم بہرام نے پڑھ دسی ملک کے حسن و جمال کے ہارے میں اپنے بیٹے کے  
 خوب خوب کان بھرے۔ اسے بتایا کہ بہرام بیگ مرحوم نے بھی اس کے ساتھ  
 صرف اس لئے شادی کی تھی کہ اس کی آنکھیں اس پڑھ دسی ملک کی لوگوں کی آنکھوں  
 کی طرح سیاہ تھیں۔ اور بھر بیٹا؟، بیگم بہرام نے بات حتم کرتے ہوئے کہا۔ "طبعیت کی  
 ایسی حلیم کہ بالکل بھیریں، اور آواز میں ایسی لطافت جیسے رہاب کے تاروں پر اوندوں  
 گر رہی ہوں۔ میرا دل بچھے سے کہہ رہا ہے کہ میری بھویاں نہیں ہے دہاں ہے"

"کہاں؟" حتم بیگ نے پوچھا۔

اور بیگم بہرام اوس ہو گئی۔ پھر فوراً سنپھل کر بولی۔ "دیں بیٹا جہاں تم جائیں ہو۔"  
 "مگر آناں؟" حتم بیگ نے کہا۔ "یہ میرا کام نہیں ہے، تمہارا کام ہے۔"  
 "لو پھر وہی بات؟" بیگم بہرام نے فرمادی۔ "یعنی میں اس غُرمیں اپنے بیٹے کی  
 دلہن ڈھونڈنے، ابھی آن دیکھنے کوں میں گھستی بھروں! نہیں بیٹا۔ یہ تمہارا کام ہے۔  
 اور کام صرف اتنا سا ہے کہ..."

پھر بیگم بہرام نے اپنے بیٹے کو کام کی تفصیل فرماتے الفاظ میں تلنے کی کوشش  
 شروع کر دی۔ مگر بیٹا بیٹھا سگرٹ پر سگرٹ پھونکنے کا۔ اور موچھوں کی نوکوں میں  
 لگے ہوئے خشک مووم کو بھاڑتا رہا۔

ہم بیگ جب پڑھی ملک کے سب سے بڑے شہر کے ہوائی اڈے  
 پر اتر، قوائے اکٹھے اتنے بہت سے لوگوں سے ہاتھ ملانا پڑے کہ اس کا استخراج  
 ہاتھ دکھنے لگا۔ پھر اس نے ہاتھ کو پسون کی جیب میں رکھ کر صرف گردن کی جمیش  
 سے تعارف و تسلیم کا فرض ادا کرنا چاہا۔ مگر لوگوں کی عقیدت اتنے جوش میں تھی کہ

انہوں نے ہم بیگ کا ہاتھ پتوں کی جیب میں سے گھسیٹ کر ایک مقدس توبیزی کی طرح اپنے دلوں ہاتھوں میں دبایا۔ اس کے ساتھ ہم بیگ کے لگھے میں اتنے ہار ڈالنے لگئے کہ اگر اس کے سیکر ٹری ساتھ ساتھ ہارا تارتے نہ جاتے تو بچوں کے انبار میں ہم بیگ کو ڈھونڈنا مشکل ہو جاتا۔ پھر خوب بیہہ تو اکہ قریب قریب ہر بار اس کی دلیں یا بائیں موچھیں انکے گیا دراس سے ہر صافتہ سے پہنچے اپنی موچھے کو ہماری دستبرد سے یوں تو اتر کے ساتھ آزاد کرنا پڑا جیسے وہ صافخوں کے لئے ہاتھ کے بجائے موچھے پیش کرنے والا ہے۔

ہوا تی اٹے سے جائے قیام تک کے تین میل طے کرنے میں تین گھنٹے صرف ہو گئے مکاؤں کی بالکونیوں پر سے اس پر بچوں کے ٹوکرے اُٹ دیئے گئے اور وہ اس دوران موچھوں پر اتنے والی ہتھیوں کو چھیننے میں رکارہا۔ شہریوں نے ملے تالیوں کے اس کے کاؤں کے پردوں پر جسے گھونٹے بر سادیتے، وہ جہاں سے بھی گزرنا، لوگوں نے اسے ایڑیاں اٹھا کر دیکھا کہ یونکہ وہ ہماری گردگی سیٹ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اور اس کے پہلو میں بیٹھا ہوا میرزاں خاص جیسے اس کے سر پر بیٹھا تھا جب اس کی ہماری گذر جاتی تو لوگ فہقہے مار مار کر ہنسنے لگتے اور جن کی موچھیں بھیں، وہ اپنی موچھیں سنوارنے لگتے۔ ایک بار اس نے پلٹ کر دیکھنے کا بھی حوصلہ کیا۔ لوگ کھلی سرک ک پر بے تر تباہی سے پھیل کر ہنستے ہوئے، ایک دوسرے کے ہاتھوں پر چنانچہ اس سے ہاتھ مار رہے تھے اور پھر پیٹوں کو ہاتھوں سے دبا کر ہنسی پر قابو پانے میں کوشش کرتے۔

«یہ کیا ہو رہا ہے؟» اس نے میرزاں خاص سے پوچھا۔

اوہ میرزاں بولا۔ «عوام اورے خوشی کے ہنس رہے ہیں۔»

وہ اسے کیسے بتاتا کہ عوام دراصل کیوں ہنس رہے ہیں۔

”یہ ٹھیک ہے“ اس نے جائے قیام کے غسلخانے میں جا کر سوچا۔ ”یہ ٹھیک ہے کہ اس ملک میں میرے آٹھ کارگانے بانج بنک اور دو بیمہ کمپنیاں ہیں۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ اس ملک کی لگ بھگ آدمی اقتصادی قوت کی بائیکیں میرے ہی ہاتھ میں ہیں۔ مگر ایسا استقبال بھی کیا کہ انسان کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دے۔ آخر اس زور کے استقبال کی ضرورت ہی کیا تھی؟“

”آخر اس زور کے استقبال کی ضرورت ہی کیا تھی؟“ اس نے کپڑے ہمنے اور موچھوں کی نوکوں میں سوزنی باریکی پیدا کرنے کے بعد ڈرانگ روم میں جا کر اپنے میزبان سے پوچھا۔

میزبان تکلف میں پڑ گئے اور کہنے لگے کہ ابھی کہاں، ”ابھی تو آپ ہمارے ہاں کے تعلیمی اور تہذیبی اور صنعتی اداروں میں قدم و نجف فرمائیں گے۔ ابھی تو آپ ہمارے نماز کو اپنے قدم سہنست لزم سے نمازیں گے، اور آپ کو سپاس میں قبول فرما ہوں گے اور خیالتوں کو روشنی بخشنا ہو گی اور ...“

بات یہ ہے صاحب، ہم بیگ نے میزبانی خاص کی بات یوں کاٹ دی اور پھر کچھ اس انداز سے بولنا شروع کیا جیسے وہ اپنے دھن میں اپنے مرکزی دفتر کی گردشی کر سی پڑھا کسی غیر ملکی تجارتی وفد سے سودا طے کر رہا ہے۔ بات یہ ہے کہ آتنا ہی کافی ہے۔ میں سیاسی آدمی نہیں ہوں اور مجھے ان باتوں سے کوئی لچکی نہیں۔ آپ نے اتنی محبت کا اظہار کیا۔ سو آپ کا مشکر ہے۔ لیکن میں تو یہاں آپ کا ملک دیکھنے کے بجائے اپنا کاروبار دیکھنے آیا ہوں۔ ساتھ ساتھ آپ کا ملک بھی دیکھتا جاؤں گا۔“

اپنے تین درجن سیکرٹریوں میں گھرے ہوئے مخفی ہم بیگ کی ایک مستقیم بات نے چھوڑی پہشانیوں اور چکتی کھوپڑیوں پر سلوٹیں پیدا کر دیں۔ سب ایک دوسرے کی بغلیں جھائکنے لگے مگر میزبان خاص نے حالات کو سنبھال لیا اور آخر طے پایا کہ جب

ہم بیگ اپنے اداروں کے معاشرے کے بعد واپس ہو گا تو اسے ایک خصیٰ نیافت میں ضرور شرکیں ہونا ہو گا۔

”اور آج شام میرے ہاں کی ضیافت تو ہے ہری“ میر بان خاص نے آخر میں کہا۔

”جی نہیں“ ہم بیگ بڑی سمجھدی سے بولا۔ سچو بات طے ہوئی ہے، اس زین آپ

اختاذ کر رہے ہیں۔ آج شام کو تو مجھے اندر دن لٹک روانہ ہو جانا ہے۔“

اور یہ اس شام کا ذکر ہے جب کوئی ڈیڑھ میئنے بعد ہم بیگ عازم دھن ہوٹ کے لئے اس لٹک کے سب سے بڑے شہر میں واپس آیا اس کے طیارے کو علی الصبا ج پرواز کرنا تھی اس لئے شام کو موعدہ ضیافت کا انتظام کیا گیا۔

ایک سے لباس والے قیوں درجن سیکڑیوں میں گھرے ہوتے ہم بیگ کے ساتھ پہنچنے تو میر بان خاص موسیٰ حالات کے بازے میں تبادلہ خیالات کرتا رہا۔ پھر جب اسے کھانے کی لذی اور سبی ہوئی نہایت طویل میز پر لکر بٹھایا گیا۔ تو اس کے تیور دیکھ کر بدلتے اس کے داتیں اور بائیں دو لڑکیاں بھی تھیں جو غر کے اس دور میں سے گزر رہی تھیں جب جوان کا نئے میں مل جاتی ہے اور اگرچہ میر بان خاص اس کے بالکل سامنے بیٹھا نہا مگر اس کے بھی داتیں بائیں نوجوان لڑکیوں کی ایک قطار دوڑتاک چلی گئی تھی۔ بوڑھے لوگ اور ان کی بیویاں یادو مرے لفظوں میں ان لڑکیوں کے دالدین میر کے پرے مردوں پر جمع تھے۔

میر بان خاص نے ہم بیگ کے داتیں بائیں اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ دونوں میری بیٹیاں ہیں۔“

”خوب!“ اس نے کہا اور نیپ کرنے سے کھیلنے لگا۔

دھوت کے شروع ہوتے ہی اس کے داتیں بائیں کی لڑکیاں اسے ٹوٹنگے اور

ڈشیں سپش کرنے لگیں۔

”بیر پسند فرمائیے گا؟“ دایں لڑکی نے کہا اور جیسے رباب کے تار پر چار بوندیں گر گئیں۔

”جی نہیں۔ شکریہ“ اور ہم بیگ نے ہائی طرف کی ایک ڈش کو دیکھا۔

”بیر تو یقیناً ناگوار خاطر نہیں ہو گا؟“ دایں لڑکی وہی ڈش اٹھا کر بولی اور رباب کے تار پر چند اور بوندیں ٹپک پڑیں۔

”جی شکریہ!“ ہم بیگ سامنے دیکھنے لگا۔

”بیر ملا حظہ فرمائیے!“

”نہیں شکریہ!“

”ہمارے ہاں کا یہ خاص کھانا تو...“

”شکریہ!“

”آپ تکلف فرمادے ہیں؟“ میراں خاص نے صورت حال کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

”جی نہیں!“ ہم بیگ بولا۔ ”تکلف کیسا؟“

اور پھر دایں ہائی کے علاوہ آس پاس کی لکھیاں بھی یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ موئیخوں والے کروڑ پتی نے ایک ایک کھر کے وہی ڈوٹنگے اور ڈشیں اٹھائیں ہیں جنہیں چند ثانیے پلے وہ قبول کرنے سے انکار کر چکا تھا۔

موقع کی زراحت کو جانپ کر میراں خاص بولا۔ ”آپ کو کس چیز کا شکار زیادہ پسند ہے؟“

”شکار مجھے ترسے سے پسند ہی نہیں۔ مار پیٹ مجھے اچھی نہیں لگتی۔ ہم بیگ نے جواب دیا۔

دکھیوں میں شاید نہیں سے آپ کے مزاج کو رحمت ہوگی؟" میر بانِ خاص نے پوچھا۔

اور ہم بیگ نے موچھ پر سے چاول کا ایک دانہ اٹاتے ہوئے کہا۔ نہیں کوئی کھل نہیں کھیتا۔ وقت شائع کرنے والا کوئی کام مجھے بھلا نہیں لگتا۔"

"بہت اچھی بات ہے، بہت خوبصورت بات ہے" میر بانِ خاص نے بدیع عقیدت پیش کرنے کی کوشش کی اور پھر اس کے دائیں بائیں بیٹھی ہوتی اپنی بیٹیوں کو دیکھا۔ جن کی گھبراہٹ ان کے چہروں پر غازے کے چھپے بھی دکھی پڑ دی تھی۔ دعوت ختم ہوئی تو تقریروں کا سارا پروگرام تپڑت ہو گیا۔ کیوں کہ مم بیگ بیکاکھ اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر قبل اس کے کہ وہ اپنے سیکرٹریوں کے بھروسے میں جا گھے سے میر بانِ خاص پاک کر آیا اور کہا۔ "حاضرین کا لفاضا ہے کہ آپ سے متعارف ہونے کی عزت حاصل کریں۔ آپ کو تکلیف تو یقیناً ہو گی۔ مگر میری درخواست ہے کہ آپ انہیں مصلحت کی سعادت ضرور نہیں۔"

مم بیگ نے پڑ کر اپنے سیکرٹریوں کی طرف دیکھا اور پھر میر بانِ خاص کے قریب اگر جب سامنے نظر وڑائی، تو حاضرین ہٹ کر کھڑے تھے، اور تمام حاضرات نے پر ڈکے سے انداز میں اس کے سامنے ایک صرف باندھ دکھی تھی۔

ان لڑکیوں میں ایک عجیب و غریب اتحاد کا فرماتھا۔ وہ ایک دوسرے کی بے خبری میں ایک ہی مقصد کے لئے یہاں جمع ہوتی تھیں، اور ان میں سے بعض بھری کوششوں اور سفارشوں کے بعد ہم بیگ کی اس ضیافت میں شامل ہو پائی تھیں۔ اس تقریب کے لئے انہوں نے اس وقت تیاریاں شروع کر دی تھیں جب اخباروں نے تو پھر وہی کی ان کے مک میں آمد کی اطلاع شائع کی تھی۔ جو ذرا بھرے جسم کی تھیں۔ انہوں نے دُبلاپے کے کورس پر عبادات کی حد تک عمل

کیا تھا۔ جو دبلي تھیں، انہوں نے اپنے جسم پر گوشت کی ایک متناسب تہہ چڑھانے کے لئے ٹونکوں کے گلیں پی ڈالے تھے، سانویوں نے گورا ہونے کے لئے اور گوریوں نے سافولا بخنے کی خاطر راتوں کو بھی دہ دو تین تین گھنٹے کے بعد اٹھا اٹھا کر اپنے چہروں، ہاتھوں اور بازوؤں پر کریمیں ملی تھیں اور پاؤ ذر چھڑک کتھے۔ کئی مونا نیزا کی سکراہٹ کی مشت کرتے کرتے اپنی سکراہٹ بھی گتوں بیٹھی تھیں اور ایسی سکراہٹ کی عادی ہو چکی تھیں جسے صرف دوار ہی گھر سکتے ہیں۔ کسی نے انگرڈ بر گیں کی طرح سر کو خفیض سا جھٹکا دے کر اور بالوں میں ہلاکا ساتھ پیدا کر کے بات کرنے کا اسلوب اپنایا تھا۔ کوئی نگس کے وقار اور شہزادی مارگریٹ کی ذہانت کا خول اپنے چہرے پر چڑھاتے کھڑی تھی اور کسی کو صوفیہ دوین کی سی ازخودِ نیگی اور بچکاڑیں بناؤ کا انداز جکڑتے کھڑا تھا۔ لباس حسبوں کے اشتہار بنتے ہوتے تھے اور کردار پری سے متعارف ہو لے کلتے انہوں نے ہختون بلک قدر آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر، آنکھوں کو نیم دا کر لیئے، پچھے ہنست کر اور پر کے ہونٹ کے مقابلے میں ذرا موڑا کریئے، ہختوں کو پھول کی پچھڑی کی طرح تڑپنے لگا لوں میں ڈپل پیدا کرنے اور گردن کی لمبائی کو نمایاں کرنے کی جوشیں کی تھیں دہ ایک رٹے ہوتے سبق کی طرح ان کے ذہنوں کی توکوں پر جمع ہو گئی تھیں۔ اس کے باوجود ایک کو درمی کی تناکا علم نہیں تھا۔ مگر متناسب کی ایک تھی۔

”ادھر دا یہیں طرف سے تعارف کی ابتداء ہو تو بہتر ہے“ میر بان خاص نے تجویز پیش کی اور قتلارم کی دائیں طرف پہنچنے پر کھڑی ہوئی میر بان خاص کی بڑی بیٹی جیسے قدر آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

میر بان خاص نے ایک تدم دائیں طرف بڑھایا۔ پھر مڑکر دیکھا تو سہم بیگ دیہن کھڑا تھا۔

پلٹ کر دہ اس کے قریب آیا تو سہم بیگ بولا۔ ”یہ سلسہ طویں ہو جائے گا“ اور

مجھے جلدی سے جا کر سو جانا ہے، کیونکہ طیارہ علی الصباح اڑ رہا ہے۔ پھر میں یہ بھی نہیں  
چاہتا کہ خواتین کو میری وجہ سے تکلیف ہو۔ میں یہیں سے سب کی خدمت میں تسلیمات  
عرض کئے دیتا ہوں۔۔۔ تسلیمات! اس نے دونوں پانیں جوڑ کر مرکوڈ راسا نجھ کا یا۔  
نقموں کی تیز روشنی میں اس کی موچھوں کا سایہ اس کے گھٹنوں تک چلا گیا، اور پھر  
ہم بیگ اپنے سیکرٹریوں کی طرف روانہ ہو گیا۔

تنا آنا شدید ہو گیا جیسے کوئی چاہے تو اُسے چھوٹے۔

ہم بیگ اپنے سیکرٹریوں اور میر بانِ خاص کے ہمراہ دور بخل گیا تھا۔

لڑکیوں کی صفت جیسے زمین مر گرد گئی تھی۔

پھر ایک لڑکی صفت سے نکل کر مجھے ایسی آواز میں بولی، جیسے ڈھول کے پردے پر  
پتھر گرد ہے ہوں۔ ہاتھ کیسا چیونٹا سا ہے بے چارہ۔ اور اس نے ایک تھکہ اُگلا۔  
ایک اور لڑکی صفت سے قوت کر بولی ”آج معلوم ہوا کہ تھا انسان کو صرف  
مشی ہی سے نہیں بناتا۔ بعضوں کو تنکوں سے بھی بناتا ہے۔“

”مجھے تو اس کی موچھیں اُنگے کی لگیں۔“ قبرسی بھی۔

”بھی کسی کو موچھوں کے سوا کچھ اور نظر نہ رایا ہو تو کافر ہو، مجھے تو صرف دو موچھیں  
کھڑی نظر آتیں۔“ چوتھی نے کہا۔

لڑکیوں کے نقموں سے ساری فضائوں نجاح اُٹھی۔

کار پر سوار ہونے ہوتے ہم بیگ نے چونکہ کر میر بانِ خاص سے پوچھا۔

”یہ کیسی آواز تھی؟“

میر بانِ خاص جلدی سے بولا ”لڑکیاں ہنس رہی ہیں۔“

وہ اسے کیسے بتاتا کہ دراصل وہ رد رہی ہیں۔

## وہشی

”آگئی۔“ بحوم میں سے کوئی بولا اور سب لوگ یوں دو دو قدم آگے بڑھتے جیسے دو دو قدم پیچے کھڑے رہتے تو کمی غار میں گرد جاتے۔  
وہ کتنے بڑا ہے؟“ بحوم کے پیچے سے ایک بڑھیا نے پوچھا۔  
”پانچ لمبہ رہے۔“ بڑھیا کے عقب سے ایک پتواری بولا۔  
اور بڑھیا ہٹر ہٹر کر بحوم کو چیرتی ہوتی یوں آگے بڑھنے لگی کہ سب لوگ اس کے بجائے بڑھیا کو دیکھنے لگے۔  
”عجیب وہشی عورت ہے۔“ ایک شخص نے اپنی ٹھوڑی سہلاتے ہوئے کہا۔ لے کے جہڑا توڑ ڈالا۔

”ابے پاگل ہوتی ہے کیا؟“ ایک اور نے فریاد کی۔  
اس نے میں بس آگئی۔ کندھر نے کھڑاک سے دروازہ کھولتے ہوئے کہا ”پہنچ عورتی۔“  
بحوم کے وسط میں پہنچی ہوتی بڑھیا رک گئی اور بحوم نے بڑی ناگواری سے دو حصوں میں بٹ کر اسے راستہ دے دیا۔  
بڑھیا نے سر پر سے چادر اٹھا کر، بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ پھر چادر کے ایک پلوٹ کو سمجھی میں پکڑ دیا اور دو دیہ بحوم پر فانتحانہ نظر ڈال کر کندھر سے کہنے لگی۔ تیری مان نے

تجھے بسم اللہ پڑھ کر جا ہے لڑکے ۔  
وچل آبھی مانی ۔ کندھ کٹرنے شرما کر کہا۔  
درستہ تو نیں دیسے بھی بنائیتی۔ ادھا تو بنا بھی لیا تھا پر تو نہیں بھو بات کہی ہے دُ  
ہزار روپے کی ہے ۔ بڑھیا نے بس کی طرف جاتے ہوتے کہا۔

پہلی سیرھی پر قدم رکھتے ہی دو دوسرا سیرھی کو ہاتھ سے جکڑ کر بیٹھا گئی جیسے  
بہت بلندی پر بیٹھ کر جکڑا گئی ہے۔ کندھ کٹرنے اسے تحام لیا۔ ہاتھ پر کٹر کر اٹھایا اور  
دروازے کے سامنے ہی ایک سیٹ پر بٹھا دیا۔ پھر سب لوگ بس میں باہر دیتے گئے،  
اور اسی میں کندھ کٹر بس کے پرے سرے پر قیچ ڈگیا۔

بڑھیا نے ذرا سا اٹھ کر، سیٹ کو ہاتھ سے ایک دوبار دبایا اور آہستہ سے بولی۔

”بڑی نرم ہے“ بس چلی تو اس نے دائیں طرف دیکھا۔ ایک گوری چٹی عورت ادھر ایسا  
زنگ کی صاف ستری سارہی پہنے۔ سنہری فریم کی عینک لگاتے، سفید چھڑے کا پرس  
ہاتھ میں لئے بیٹھی تھی اور کھڑکی سے باہر دیکھے جا رہی تھی۔

بڑھیا نے بھی گردن کو ذرا سا سیکھنے کر باہر دیکھا۔ ہر چیز پیچے کی طرف بھائی  
جا رہی تھی۔ وہ آنکھیں مل کر سامنے دیکھنے لگی، پل بھر بعد اس نے گوری چٹی عورت کی  
طرف دوبارہ دیکھا۔ پھر اپنی انگشت شہادت اس کے لکھنے پر بسجادی۔ عورت نے  
بھویں سیر کر بڑھیا کی طرف دیکھا تو وہ بولی۔ ”چکر آجائے گا باہر مت دیکھو۔“  
گوری چٹی عورت مسکراتی اور بولی۔ ”مجھے چکر نہیں آتا۔“  
”مجھے تو آگیا تھا۔“ بڑھیا بولی۔

”تمیں آگیا تھا تو تم باہر مت دیکھو، مجھے نہیں آتا اس لئے میں تو دیکھوں گی۔“  
عورت نے کہا اور بڑھیا نے پوچھا۔ ”تو کیا تم باہر نہیں دیکھو گی تو تمیں چکر آجائے گا۔“  
عورت کی مسکراہست بیکا ایک غائب ہو گئی اور باہر دیکھنے لگی۔

بڑھیا کو اگلی سیٹ پر ایک عورت کا صرف سر نظر آ رہا تھا، اُس نے بالوں میں زرد بُنگ کا ایک پھول سچار کھا تھا۔ بڑھیا نے دراسا اُسکے جھکا کر پھول کو غور سے دیکھا، پھر انگلی سے اپنی ہمساتی کا گھٹنا بھجا کر بڑی رازداری سے بولی۔ “یہ پھول اصلی ہے کہ نقلی؟”  
“نقلی ہے!“ عورت بولی۔

“نقلی ہے تو سونے کا ہو گھا؟“ بڑھیا نے راتے ظاہر کی۔

“رنگ تو سونے کا سا ہے،“ عورت نے کہا۔

“مجھے تو اصلی ملگتا ہے۔ کسی مچھاری سے اٹا رہا ہے،“ بڑھیا بولی۔

“تو پھر اصلی ہو گا،“ عورت نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

بڑھیا نے دراسا ہیران ہو کر گوری چمی عورت کی طرف دیکھا اور پھر انگلی سے اس کا گھٹنا بھا دیا۔

“کیا ہے؟“ عورت نے بھویں سکیر کر پوچھا۔

بڑھیا بولی۔ “عجب بات ہے۔ باہر قدم دیکھتی ہوا وہ پکڑ مجھے آ جاتا ہے۔“

عورت دراسی مسکرا تی۔

“سنوا!“ بڑھیا نے کہا۔

“کیا ہے؟“ عورت نے پھر سے بھویں سکیر لیں۔

“دلیدی ہو؟“ بڑھیا نے سوال کیا۔

“دکیا؟“ عورت نے جیسے بُرا مان کر پوچھا۔

“ہسپتال کی لیڈی ہو؟“ بڑھیا نے وضاحت کی۔

“نہیں!“ عورت بولی

“تو پھر کیا ہو؟“

”مگیا؟“

”کیا کرتی ہو؟“

”کچھ نہیں کرتی۔“

”کچھ تو ضرور کرتی ہو یہ بڑھیا نے دائیں اپنی سر بلکہ کہا۔

”ٹھکٹ لے لوئی یہ بڑھیا کو اپنے نمر کے اوپر سے کندکٹر کی آواز سناتی دی۔“

”دے دو“ بڑھیا نے چادر کے پلر کو منہجی سے آزاد کر دیا۔

”کہاں جاؤ گی؟“ کندکٹر نے پوچھا۔

”گھر جاؤں گی بیٹا،“ بڑھیا بڑے پیار سے بولی۔

کندکٹر نے سہاگوری چیزیں سورت بھی بڑھیا کی طرف دیکھ کر مسکراتے گئی۔

کندکٹر نے جیسے تمام مسافروں کو مخاطب کر کے کہا ”میں نے اسی سے پوچھا کہاں جاؤگی۔

بولی۔ گھر جاؤں گی؟“

اب کے مسافروں نے بھی کندکٹر کے تھیے کا ساتھ دیا۔

کندکٹر بہت محظوظ ہوا تھا اس نے بڑھیا کو بڑی نرمی سے سمجھاتے ہوئے بولا۔ ”آخر تو سب لوگ جائیں گے اسی۔ یہ تباہ۔ میں کہاں کا ٹھکٹ کاٹوں؟“

”واللہ کا،“ وہ بولی۔ میرا گھر والٹن کے پار ایک گاؤں میں ہے۔“

مسکراتے ہوئے کندکٹر نے ٹھکٹ کاٹ کر بڑھیا کو دیا اور بولا۔ ”ساثرے پانچ

آئے دے دو۔“

”ساثرے پانچ آئے ہے“ بڑھیا نے چادر کے پلوکی گرد کھوتے ہوئے پوچھا۔ ”ساثرے پانچ آنے کیے؟“ غونٹ کہہ رہا تھا صرف چار آنے لگتے ہیں۔ اس نے تو مجھے صرف یہ گول مول چھوٹی ہی دی ہے۔“ اس نے چھلی دو انگلیوں کی پوچھیں میں تھام کر کندکٹر کی طرف بڑھا دی۔

کند کڑ بولا۔ ” نہیں مانی۔ چار آنے نہیں۔ سارے ہے پانچ آنے لگتے ہیں۔ ”  
 بڑھیا کی آواز تیز ہو گئی۔ ” ساری دنیا کے چار آنے لگتے ہیں۔ میرے سارے ہے پانچ  
 آنے لگ گئے ہے کیوں؟ ہڈیوں کا تو ڈھیر ہوں۔ میرا بوجھہ کیا۔ لے یہ چار آنے۔ ”  
 ” عجیبِ مصیبت ہے۔ ” کند کڑ کے تیور مل گئے، اور فُرہ مسافروں کو سامنے  
 بنکر تقریر کرنے لگا۔ ” میں تو کتنا ہوں کہ سرکار کو قانون پاس کرنا چاہیے کہ جو پرانی پاس  
 نہ ہو، ہیں میں سفر نہ کرے اب اس مانی کو دیکھئے۔ میوہ سپتال کے شینڈ پر بس ہیں بھی  
 ہے۔ والٹن جا رہی ہے اور کہتی ہے والٹن بھی جاؤں گی اور سارے ہے پانچ آنے بھی نہیں  
 دوں گی راس لئے کہ کسی نے اسے چارہ ہی آنے دیتے ہیں۔ ”  
 بڑھیا پتھے کی طرح بولی۔ ” کسی نے کیوں؟ اپنے غونٹ نے دیتے ہیں۔ ”  
 کند کڑ نے سلسہ تقریر جاری رکھتے ہوئے اور اب کے مکراتے ہوئے کہا۔ ” اس  
 لئے کہونٹ نے اسے صرف چار آنے دیتے ہیں۔ اب اسے کون سمجھاتے کہ بس سرکار  
 کی ہے غونٹ کی نہیں ہے۔ غونٹ کی ہوتی تو وہ تم سے چارہ ہی آنے لیتا۔ ”

” کیوں وہ کیوں لیتا چار آنے؟ ” بڑھیا بولی۔ ” وہ تو میرا بھتیجا لگتا ہے۔ کہاں ہے  
 ردہ اپنے ریڑھے پر دودھ لاتا ہے۔ اج میں اسی کے ریڑھے پر تو آتی تھی۔ چار آنے  
 چھوڑ چاہ پیسے بھی نہیں مل سکا۔ اس کی مجال تھی جو ماہنگا۔ گود میں سکھلا یا ہے۔ اس کی سالی  
 یہاں سپتال میں بیمار پڑی ہے۔ میں نے کہا چلو، اسے دیکھ لوں۔ اسی ریڑھے پر وہ اپس  
 آجائیں گی۔ مگر آج لوٹکی کی عالمت اچھی نہیں ہے۔ اس لئے غونٹا ہیں وہ گیا ہے اور  
 مجھے یہ چوتی دے کر کہا ہے کہ گھر علی جاؤ۔ اب تم سارے ہے پانچ آنے لگا رہے  
 ہو تو یوں کر دیجھے کسی چار آنے والی جگہ پر بھادو۔ میں تو کسان عورت ہوں۔ نیچے بھی بٹھو  
 جاؤں گی۔ تم کہیں اس نرم گلتے کے تو سارے ہے پانچ آنے نہیں مانگ رہے ہے۔ ”  
 ” نہیں مانی۔ ” کند کڑ نے لگا۔ ” کہ کہا، ” سب سواریوں کے نیچے ایسے ہی

گذے میں ہے۔

بڑھیا نے حیران ہو کر فوچھا " تو پھر میں کیا کروں ہے؟ "

" دیڑھ آئہ اور زکالوں " کہہ کر بڑھا بولا۔

" کہاں سے نکلوں ہے؟ " وہ بولی " بتا جو رہی ہوں کہ میں گھر سے خالی ہاتھ آئی تھی۔ یہ چھٹی بھی غوٹے نے دیتے۔ مل اُسے نومادوں کی گی۔

کہہ کر صاف طور سے اپنے غھٹے پر غبڑ کر رہا تھا۔ بولا " مجھے تو آج ہی چاہئے مانی میں تو سمجھ کاٹ چکا ہوں۔ جلدی کرو۔ اتنے بہت سے اٹینڈ گز رچکے ہیں، آتنی بہت سی سوریاں جمع ہو گئی ہیں۔ سب کے ملکھٹ کہاٹنے میں، کوئی چکر آگیا تو جان آفت میں کردے گا۔ بھی لوگوں فدا کے لئے اس مانی کو سمجھا اور جانا داد المعن ہے اور کرایہ ماڈل ٹاؤن کا بھی نہیں دے رہی ہے۔ پھر کہتی ہے چوتی سے زیادہ ایک کوڑی بھی نہیں ہے۔" بڑھیا کے سامنے والی سیٹ پر باوی میں پھول سجا کر بیٹھی ہوئی عورت نے پڑھ کر کہا " ایسوں کی تلاشی لبی چاہیے۔ ان کی جیسیں اکنہیں دو نیتوں سے بھری ہوتی ہیں ہے۔"

بڑھیا اُس کے سر کے اوپر چھپنے آئی۔ دیکھا تو میرے بیٹے کی گھروالی ہے کہ تجھے میری جیبوں کا حال بھی معلوم ہے۔ میر میں کوڑی کا پھول لگائیں سے بیچھے میں عقل نہیں بھر جاتی بی بی رانی ہے۔

پھول والی عورت دانت کچھا کر رہ گئی۔

گوری چٹی عورت نے بڑھیا کا بازو پھر لکر اُسے سیٹ کی طرف کھینچا اور بڑھیا بیٹھا گئی۔

" عجیب و حیری عورت ہے۔ یہ کہی کی آواز آتی۔

" یہ کون بولا ہے؟ " بڑھیا نے پڑھ کر بس کے آفری سرے تک تظریں دوڑائیں۔

”ذرا ایک بار پھر لوئے کہ میں اس کی زبان یوں لمبی لمبی کھینچ کر کھڑکی سے باہر چینیک دوں۔“

گوری چٹی عورت کو جھپٹ جھپڑی سی آگئی اور وہ یوں سمجھ گئی جیسے بڑھیا نے فوجی مجھ لکھتی ہوتی اور خون ٹپکاتی ہوتی نہ ان اُس کے اوپر سے گزار کر کھڑکی سے باہر اچھال دی ہے۔

”دیکھا آئی ۔ کندک کڑ جو اس دوران میں دوسرے مسافروں سے ملخت کاٹنے لگا تھا اس کے قریب آ کر سختی سے بولا ۔“ ساڑھے پانچ کافے دے گئی یا نہیں؟“

” تو تو تھا نیداروں کی طرح بولنے لگا رکھ کے۔ کہہ جو رہی ہوں کہ چوتی یہ مرہی ۔ ہاتھ رہے چھپیسے تو وہ میں تجھے پہنچا دوں گی۔ محل والٹھ میں آکر بیٹھ جاؤں گی اور تو آتے کھا، تو تیرے ہاتھ پر رکھ دوں گی۔ کھرے کر دینا۔“

”دو اور سنو ۔“ کندک کڑ نے سب مسافروں سے فریاد کی۔

پھر بیجا ایک اس کے تنے ہوتے تیور ڈیلے ڈینے لگئے اور وہ ایک سفید پوش بزرگ کے پاس جا کر بچک گیا۔

بڑھیا نے انگلی سے گوری چٹی عورت کا گھٹنا بھایا اور جب عورت نے اس کی طرف دیکھا تو بڑھیا بولی۔ ”دیکھ رہی ہو ۔“

عورت نے اُسے سمجھا تے ہوتے کہا۔ ”لگتے تو مانی ساڑھے پانچ ہی آنے ہیں، پھر یہ بس سرکاری ہے۔ یہ لذکار امرکار کا لذکر ہے۔ ایک آنے بھی کسی سے کہ لے تو یا اپنی جیب سے ڈالے گایا تو کوئی چھوٹ جانے کی غریب کی۔“

”ہے ہے بے بے چارا۔“ بڑھیا نے پیارے کندک کڑ کی طرف دیکھا۔ میں نے تو عمر بھرا پناہ ذق اپنے باہتوں سے کلایا ہے۔ میں کیوں کسی کے رزق پر ڈالکر ڈالوں چھوپیوں کے تیچھے مجھے کیا نہ تھی، وہ غونٹا ہی دھوکا دے گیا۔ پر اسے کیا پتا،

وہ بیچارا بھی توڑ پڑھے پرلا ہو ر آئے، اب کیا کروں؟“  
”یوں کرو،“ گوری چٹی خورت نے اپنے پرس کھولتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہیں...“  
انتہے میں کندکٹر اگلیا بڑھا بولی۔ ”بھتی بڑکے! مجھے تو خبر نہیں تھی کہ اس طرح...“  
کندکٹر بولا۔ ”بس مالی۔ اب سارا حساب تھیک ہرگز کیا ہے۔ مجھے والمن پر ہی  
آتا رون گا۔“

بڑھا بھل گئی۔ ”میں نے کہا تھا ناک تیری ماں نے مجھے سیم انڈ پڑھ کے جملے ہے  
پر یہ بتاڑکے — چوتھی ہی پر راضی ہو جانا تھا تو سارا ہے پانچ آنے کا جھکڑا کیوں چالایا؟“  
”حساب تو مالی سا ہے پانچ ہی آنے سے پورا ہوا ہے،“ کندکٹر بولا۔  
”تو میں چھ پیسے کہاں سے لاؤں؟“ بڑھا پھر اوس ہو گئی۔

”چھ پیسے مجھے مل گئے؟“ وہ بولا  
”کہاں سے ملے؟“ بڑھا فوچا۔  
”کندکٹر بولا۔“ ترس کھا کر دے دیئے۔  
”اُس چودھری نے دیتے ہیں۔“ کندکٹر نے سفید پوش بزرگ کی طرف اشارہ  
کرتے ہوئے کہا۔

”کیوں دیتے ہیں؟“ بڑھا نے جیراں ہو کر فوچا۔  
”کندکٹر بولا۔“ ترس کھا کر دے دیئے۔  
”بڑھا اٹھنے کی کوشش میں سیٹ پر گر پڑی،“ کس پر ترس کھایا؟“ وہ چلاتی۔  
”تم پر اور کس پر؟“ کندکٹر بولا۔

”بڑھا بھڑک کر اٹھی اور جنحے کھربولی۔“ ذرا میں بھی تو دیکھوں اپنے ترس کھلنے  
والے کو...“

گوری چٹی خورت فوراً پرس بند کر کے بڑھا کی طرف دیکھنے لگی۔  
”بڑھا اچھت کی راڑ اور سیٹوں کی پشتیوں کے سماں سے سفید پوش بزرگ کی طرف

جلنے لگی۔ یہ چھپیے کیا تیری جیب میں بہت کوڑ رہے تھے کہ تو نے ترس کھا کر میری طرف یوں پھینک دیتے ہیسے کتے کی طرف ہدی چھکلی جاتی ہے۔

”یجھے، یہ ہے بھلانی کانوان۔“ کوئی بولا۔

سفید پوش بزرگ ہازمگ مٹی کا سا ہو گیا اور ٹرھیا بولتی رہی۔ اسے سمجھی دا آہیں کے تو مجھ پر ترس کھاتا ہے جس نے سالٹ سترسال دھرقی میں زیج ڈال کر پودوں کے اگنے اور نخوشوں کے پکنے کے انتظار میں کاٹ دیتے ہیں تو ان ہاتھوں پر چھپیے رکھ رہا ہے۔ جنہوں نے اتنی مٹی کھو دی ہے کہ اکٹھی ہو تو پھاڑن جاسے اور تو مجھ پر ترس کھاتا ہے؟ کیا تیرے کوئی ماں بہن نہیں ہے ترس کھانے کے لئے ہے کوئی اندھا فقیر نہیں البتھے رستے میں؛ شرم نہیں آتی تجھے ایک کسان عورت پر ترس کھاتے ہوتے؟“

پھر وہ کندکٹر کی طرف پڑی۔ یہ چھپیے جو اُس نے مجھ پر مٹھوکے ہیں۔ اسے والپس دے دے اور مجھے یہیں آتا رہے۔ میں پیدل ٹلی جاتی گی۔ مجھے پیدل چڑا آتا ہے۔ ٹرھیا خاموش ہو گئی۔ بس میں صرف بس چلنے کی آواز آ رہی تھی۔

بس ایک لمحہ بعد سینہ پر رکی تو ٹرھیا سیر جیوں کی پروادا کے بغیر در داڑے میں سے لکھی اور باہر مٹک پر ڈھیر ہو گئی۔ پھر وہ اٹھی، کپڑے جھاڑے اور ناقابلِ قیصیں تیزی سے بالعن کی طرف جانے لگی۔

بس میں سے کسی کی آواز آتی۔ ”عجیب وحشی عورت ہے!“

---

## جن و اس

لگی میں قدم رکھتے ہی ما سٹر محمد یونس کو محسوس ہوا کہ دھلٹ جگہ پر آگیا ہے۔ باہمیں طرف تو خیر ایک مکان کا پچھواڑہ تھا، مگر دائیں ہاتھ کو ڈیڑھی میڑھی دیوار پر عورت کی اور ان کے کندھوں سے لگے ہوتے بچوں کے میئے کچیلے بے دخلے چہرے یونس رکھتے تھے۔ جیسے گھر دنچی پر چھوٹے بڑے کافی لگے گھرے بجے ہوتے ہیں، لگی طے کرنے تک ماہر یونس نے ان کی طرف کوئی تین بار دیکھا اور تینوں بار اُسے یہی شبہ گزرا کہ سب نے بچوں سمیت، ایک ساتھ اُسے آنکھ ماری ہے۔ اگر منشی اللہ یار ناشاد اس کے آگے آگے نہ جا رہا ہوتا تو وہ کہیں رُک کر سوچ لیتا کہ اگر آگے جانا ہمت ضروری نہیں ہے تو آگے نہیں جانا چاہیتے، اگر بڑے کی ایک ڈھیری پر جو مرغی مُرغادانہ ڈنکا چک رہے تھے، وہ بھی پسے تو کڑکڑا نے مگر پھر جو بچیں کھوئی کہ ما سٹر یونس کو انسانوں کی طرح دیکھ دیکھ کر نسلکرنے لگے۔ سب سے بڑا ستم یہ ہوا کہ لگی کے بالکل مقابل والے درازے پر جو عورت باہمیں کندھے سے چوکھٹ کا سہارائتے اور صرف باہمیں ٹانگ پر زور دیتے رکھتی تھی۔ وہ اتنی خوبصورت بھی کہ ما سٹر یونس کو اسے دوسرا بار دیکھنے کا حوصلہ ہی نہ ہوا۔ وہ کالے تہمند کالے چولے اور کالے روپیے میں سچ مجھ پچک رہی تھی۔ پھر اس عورت کے قریب پہنچ کر تو اسے یقین ہو گیا کہ وہ سراسر غلط جگہ پر آگیا ہے۔

عورت نے دماغ کو چیر دینے والی خوشبو لگا رکھی تھی اور خوشبو صرف سو بکھنے ہی کی نہیں، دیکھنے کی بھی تیز ہوتی ہے۔ سو ماسٹر یونس نے خوشبو کے منبع کی طرف دیکھا اور اسے یعلوم کر کے صدمہ ساپتا کہ یہ عورت ڈقریب سے بھی خوبصورت ہے۔ کامے دوپٹے کے نیچے اس کے دُھروں پال اس کے کندھوں اور سینے پر بکھرے ہوتے تھے، کافوں کی طرف جاتی ہوتی چری دیں آنکھیں پتوں سے آویں آویں دھکی ہوتی تھیں، اور اس کے ہنوموں پر کچھ ایسی خفیف سی ملکھہ ہم گیر مسکراہٹ تھی کہ دیکھو تو کچھ نہیں اور سوچو تو بہت کچھ ہے۔

مشی اللہ یار کے قدموں کی تیزی بتادری تھی کہ وہ دائمی طرف کو فوراً مژجاناً اچاہتا ہے۔ ملکھہ بیکاکیں دہلوں بختے پن سے دک گیا جیسے نہ گستاخ اس کا انعام نیک نہ ہوتا۔ «خیر ہے بیگماں!» اس نے عورت سے پوچھا۔ پھر فوراً بولا۔ «ہمارے سکول میں یہ نئے ماسٹر آتے ہیں۔ ماسٹر محمد یونس، انگریزی پڑھاتے ہیں، لی۔ ملے پاس ہیں۔» بیگماں نے پوٹے اٹھا کر اپنی لمبی بادامی آنکھیں پوری کھول دیں اور بولی۔

«تم ہمارے پڑوسنی ہیں مشی جی۔»

ماسٹر یونس کو جواب میں کچھ نہ سوچا۔ اس نے صرف مسکانے کی کوششیں کی پھر مشی اللہ یار اس کی مدد کو پہنچا اور پچھلے دو لا جیسے بیگماں کی ات کا ترجمہ کردا ہو۔ «یہ بیگماں آپ کی پڑوسن ہے یونس صاحب!»

ماسٹر یونس جواب میں ایک بار پھر مسکرا یا، اور مشی اللہ یار کے تیکھے دائمی طرف کو مڑ گیا۔ مانے مغلی دروازے کے پاس پہنچنے لگ ک اسے اپنی گدھی پر بیگماں کی نظریں محسوس ہوتی رہیں، پھر اس نے پلٹ کر چندوں کی طرح دیکھا تو بیگماں وہاں نہیں تھی صرف اس کی خوشبو تھی جو ہر طرف سے اٹھی آ رہی تھی۔

«بڑی تیز خوشبو ہے!» یونس نے آہستہ سے مشی اللہ یار کو جیسے راز کی ایک

بات بتائی۔

مشی اللہ یار جو چاہی والا ہاتھ تماں کی طرف بلند کر رہا تھا، تماں کو مٹھی میں پکڑ کر ذرا سا گھوٹا۔ بیگم ان کے دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر یونس سے کچھ کہنا پا ہتا تھا، مگر عورتوں اور پتوں کا رُخ دیکھ کر مرگ گیا جو دیوار سے ہٹ آتے تھے، صحن کے پرے گوشے میں ایک جھوٹتے ہوئے چھپر کے پاس دھوپ میں ایک بڑھیا پڑھی پڑھی حشر پی رہی تھی۔ «بیر ہودے اے مشیو! وہ حقے کا کش نہم کر کے بڑی کلامی اوڑ میں بولی۔» جوانیاں مانو۔ علم پڑھاو۔ اقبال بڑھے، دشمن زیر ہوں، سجنی تھیر ہوں، ہم غریب میراثیوں کے ہنگمن کو تو اکج بھاگ لگ گئے۔ اے بازو! اے کیتاکی اولاد۔ کھڑی ہٹ کیا تکے جا رہی ہے۔ کیا اپنی عادتوں سے یہ بتانا ضروری ہوتا ہے کہ ہم میراثی ہیں؟ جا کبیں سے سی ماگ لالہ سرد یوں میں سنتی فولا و کما عرق بن جاتی ہے۔ ادھر اشیر بانکے ہاں چلی جائے کہنا روز آتشی سی بھتی ہے کہ بھڑکوں کو پلا دیتے ہو، آج بھڑکے نہیں پتیں گے تو ہمارے ملشی جی پی لیں گے، نمک کی ڈلی دہیں سے گھماتی لانا۔ آج میں نے نمک دان کے چاؤں خلنے دیکھے ہیں، اس میں حرطیاکی بیٹ جتنا بھی نمک نہیں ملا، مجھے قوتی میں نمک کی جگہ کھا۔ ملکر پلا دیتی ہوگی تو پرتو اپنی سی کردیکھیں ہمیں تیر سے جیتے جی تو مجھے مر کر نہیں دوں گی، وہ اوندھا چھے تو نے ڈس لیا تھا۔ میں تو مردیں گی تیرے جہاز سے پرشہادت کی انگلی گھما کر۔

مشی اللہ یار تماں کو مٹھی میں لئے بڑھیا کی طرف دیکھتا رہا، ماسٹر یونس بڑھی سنجیدگی کے ساتھ نئے ماحول سے متعارف ہو رہا تھا۔ ایک میل کچھی نوجوان عورت اُنگے بڑھی چوٹھانے پر سے ایک بڑا ساکٹورا اٹھایا، اسے اپنے دوپٹے سے اندر یا ہر پونچھا اور بڑھیا کے پاس آکر بولی۔ اے بھوپلی، اللہ کرے میں کل کی مرتی آج مر جاؤں۔ پر تو ایک ایک رد پے کی شرط لگا لے۔ پہنچے قوم رے گی۔

سب عورتیں ایک ساتھ ہنسیں۔ مگر بازو مسکرائی بھی نہیں۔ بڑھیا بانہوں کو ہوا میں چھیل کر پکاری۔ اے گتیا کی اولاد، کیا مجھے شرط لگا کہ ایک روپیہ لارنہے؟ بچھڑاہ ٹھاہ ہنئے لگی۔ باز بھی مسکراوی اور ہاتھ میں کٹوارے چلی گئی بچھرنشی اللہ بیار بھی زور سے ہنسا اور ماسٹر یونس نے سوچا کہ آخری کیا بات ہریں۔ آخر منطق کا وہ کون سا اصول ہے جس کے تحت اس موقع پر بڑھیا کا ہنسنا جائز تھا۔ بازو زجائے اس کی کیا لگتی ہے، زیادہ سے زیادہ بھوہو گی۔ مگر سایں تو ایسی مُمہ پھٹ بھوؤں کو فوج کے ڈال دیں۔

یکا ایک بڑھیا عورتوں اور پتوں پر بس ٹڑی۔ عقلم کیا منشیوں کو اپنے گھیرے میں لئے کھڑے ہو جاؤ اپنے اپنے گھر جاؤ۔ غشی قربانی کا گوشہ تھوڑی ہیں کہ جھیپٹ پڑ رہے ہو گئے تو۔

سب ہنسنے لگے اور ستم یہ کہ غشی اللہ بیار بھی ہنس رہا تھا۔ اس نے ہستہ ہوتے تالا کھولا۔ ہستے ہوئے زنجیر کھولی۔ ہستے ہوئے کواڑ کھولے اور کوٹھے کے اندھانے سے پہنے اُس نے یہ کہنا بھی ضروری سمجھا کہ: "اسی فوراں آخر توکسی دن بور بھی بھی ہو گی۔" "نہیں!" بڑھیا نے زبان اور تابو سے نفی کا خاصاً اوزار دار پٹا خڑھوڑ کر بڑے دُعب سے کہا۔ بچھڑھیا سہیت سب اس زور سے ہٹنے کے اپنے دروانے پرست بیگماں پکاری "اسی فوراں بولی ہو گی۔"

بڑھیا بولی "تو اور کون بولا ہو گا خوبو آں بیگم۔"

مجھنپنے کے سچلتے بیگماں نے بھی زور کا ایک قہقہہ لگایا اور ماسٹر یونس چکرا کر رہ گیا یقیناً وہ نہایت خلط اجگہ پر آ گیا تھا۔

میرک تک ہم جماعت رہنے کے بعد محمد یونس اور اللہ بیار کی راہیں انگ انگ

ہو گئی تھیں اور اب ماسٹر اور منشی کی حیثیت میں دونوں کی ملاقات ہوتی تھی ایساں آنے سے پہلے یونس نے اللدیار سے ایک طویل خط میں تجدیدِ مجتہت کی تھی اور جو لارڈِ مجتہت کا جواب پایا تھا۔ یونس مطمئن تھا کہ وہ ایک بالکل اجنبی جگہ میں نہیں ہو گکا اور اللدیار خوش تھا کہ وہ اپنے مدل سکول میں مقرر ہونے والے انگریزی کے پہلے ماسٹر کو بڑے ٹھاٹھ سے ساتھ ساتھ لئے چھرے گا، دونوں غرضِ مند تھے اس نے ملاقات کے بعد پانچ دس منٹ کے اندر وہ جدائی کے چند برس پھاند سکتے اور ہم جماعتیں کی اپنا تیمت برتنے لگے۔

سکول میں ماسٹر یونس کے پہنچتے ہی منشی اللدیار نے سکول کے چوکیدار کے مز رپر اس کا بخس اور مسٹر رکھا اور اس کے ساتھ چند لارکے کر دیتے۔ جنہوں نے مل کر کوئی ٹھے کو جھاڑا پوچھا۔ اب تفریح کے وقت میں وہ یونس کو اس کامکان دکھانے لے آیا تھا۔ یونس نے جب کوئی ٹھے میں قدم رکھا تو اسے محسوس ہوا کہ وہاں تھوڑی ہی دیر پہلے چھکھا دیا ہے۔ چککا ہے، پھر فرش کی مٹی جاگ رہی تھی، اور سوندھی سوندھی خوشبو سے کوئی لالب بھرا ہوا تھا۔ پھر اپنے چھت کے عین دریان میں ایک گول سا باریہ تھا جس میں دھوپ ایک ترچھے سے ستون کی شکل میں چھت سے فرش تک گزرا ہوئی تھی اور کوئی ٹھے کے گوشے یہ دشہ بورہ ہے تھے کوئی ٹھے میں داخل ہوتے ہی دائیں بانٹ کو منٹی کی دو ٹبری ٹبری الماریاں سی تھیں جو دیہات میں سکاریں کھلاتی ہیں اور آنچ کے ذخیرے کے کام آتی ہیں۔ منشی اللدیار نے بعد میں اسے بتایا کہ اب ان سکاروں میں پھٹے ہوئے ایک ڈھول اور ٹوٹی ایک شہنائی کے سوا کچھ نہ تھا دروازے کے بالکل سامنے والی دیوار کے ساتھ دنگ رنگ کے سوت سے بنی ہوئی رنگی پاویں کی ایک پنگڑی رکھی تھی اس پر بلیخ کر باہر دیکھنے سے کچھ ٹیڑھی دیوار کا ایک حصہ اور بیگانے کے گھر کے سامنے والا موڑ نظر آتا تھا جہاں غشی اللدیار ٹھٹھکا تھا۔ میراثیوں کے مکان نظروں سے ادھبل

رہتے تھے جو دوسری طرف ایک دُور سے میں بھی ہوتے کھڑے تھے ان کے سامنے ایک دالان تھا جس کے ایک کونے میں وہ جھگٹا ہوا پھر تھا جس کے پاس بوڑھی نوراں پر جی پر جی ختمی پر ہی تھی، یونس کی اس قیامگاہ سے نکلتے ہوتے، بائیں طرف تو یہ پھر پڑتا تھا اور واپس طرف ایک نگ ساحمن تھا اسے ایک پست دیوار، بیگماں کے گھر کے صحن سے جدا کرتی تھی، اس دیوار کے بالکل سامنے بیگماں کا کوٹھا تھا اور جہاں انہیں بیگماں کھڑی نظر آئی تھی وہ اس کی ڈیوبٹھی کا دروازہ تھا۔

کوٹھے کے فرش اور جھپٹت کی صفائی کا جائز ہیلنے کے بعد مششی اللہ یار نے یونس کو ہتھا کر کر نوراں، بالوں کی ساس اور مست است کی ماں تھی۔ بالوں کے پیدا ہوتے ہی نوراں نے اسے اپنے بھائی سے اپنے بیٹے کے لئے لامگ لیا تھا، مست است کا نام میراں بخش تھا، مگر جب اس نے جوان ہو کر شہنمائی بھائی شروع کی اور ساتھ ہی اس پر چن آئے لگے تو لوگوں نے اسے مست است کا شمارہ شروع کر دیا۔ یہ کوٹھا اسی مست است نے بنایا تھا۔ کہتے ہیں کہ جب شادی کی محفوظوں میں نکاح خوانی کے وقت ڈھولوں اور شمنائیوں کو بند کرنے کا اشارہ کیا جانا تھا تو مست است شہنمائی پر سے انگلیاں ہٹا کر نجتوں کی طرح رونے لگتا تھا۔ ایک بار جب کسی ایسے ہی موقع پر اس نے شہنمائی بھانا بندہ کی تو ایک بُوڑھے میراثی نے شہنمائی کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی، اواز بے سُری ہو گئی تو مست است نے اپنی بڑی بڑی لال انگلیں کھولیں شہنمائی کو گھٹنے پر رکھ کر تڑ سے اس کے دُٹھکرے کر دیئے اور انہیں بُوڑھے کی طرف پھینکتے ہوئے بولا۔ یہ لوچھا آج رات کا چوڑھا اسی سے جعلناہ، پھر وہ اٹھا اور چلا گیا۔ جب سے گاؤں دالوں کو یقین ہو گیا کہ مست است پر چن آتے ہیں، بوڑھی نوراں دُور دُور سے تعویذ لاتی رہی اور اپنے بیٹے کو گھول گھول کر ملأتی رہی، سونے چاندی میں مڑھے ہوئے کئی تعویذ مست است کے بازوؤں پر باندھے اور گروں میں لٹکائے، پھر کسی نے اسے مشورہ دیا کہ وہ مست است

کی شادی کر دے۔ کیونکہ جن عوام کنواروں اور کنواریوں پر ہی آتے ہیں۔ نوران برسوں سے گانے بھانے اور عبید لقرعید کی کمائی متحف کر رہی تھی۔ وہ فوراً بازو کو بیاہ لائی، مغرب مسٹ است نے شہنائی بھانما ہی بند کر دیا۔ یہ اس کی شادی کے کوئی چار ٹھیکنے بعد کی بات ہے، نوران نے بازو کو سمجھایا کہ وہ بڑے پیار کے ساتھ مسٹ است سے شہنائی بھانے کا مطالبہ کرے، مسٹ است یہیں اسی زمین پلکڑی پر چُپ چاپ بیٹھا تھا۔ بازو نے اُکر پھوپھی کا مطالبہ ڈھرا دیا۔ مسٹ است بولا۔ ڈواہ کیوں نہیں بجاوں گناہ لا دے میری شہنائی کہاں ہے؟ ”پھر وہ شہنائی بھانے لگا۔ نوران اور دوسروی میرا شنبی اور میراثی دروازے سے ایک طرف ہٹ کر خوش خوش شہنائی سننے لگے؛ بیگماں بھی اپنی ڈیورھی کے دروازے پر نمودار ہوئی۔ اور مسٹ است کو دیکھنے لگی۔ بازو جو بڑے غور کے ساتھ سراٹھا تے اور سینے پر بازوؤں کی لینچی رکھے پلکڑی کی پامنثی کی طرف کھڑی تھی۔ یہ کا یک گھبرا سی تھی۔ مسٹ است کا سارا خون کھینچ کر اُس کے چہرے میں جمع ہو گیا تھا اور اُس کا ماتھا پسینے کے قطروں سے اٹ گیا تھا اور انگلیاں جیسے نشیش میں گرفتار ہو گئی تھیں۔ تب بازو چھجع کر باہر نکل آئی اور پکاری ”میرے مسٹ است کو تو کچھ ہو گیا ہے؟“ سب لوگ اندر کوٹھے میں لکھس آتے۔ بیگماں باہر گلی میں آگئی۔ مگر پھر واپس چلی گئی۔ ”جن آگئے ہیں؟“ ایک بوڑھے میراثی نے کہا اور ”بسم اللہ“ پڑھ کر شہنائی کا میرا ایک جھلکے سے مسٹ است کے ہونسوں میں سے نکال لیا۔ مگر تھوا یہ کہ شہنائی بوڑھے کے ہاتھ میں آگئی اور مسٹ است یہ پچھے گزگی، پھر جب اُس کی نبضیں دیکھی گیئیں تو وہ مُرچکا تھا۔ اس وقت نوران نے دھڑک سے ایک دوہرڑ اپنے سینے پر مارا اور پھر ایک دوہرڑ بازو کی پیٹھ پر مار کر بین کرنے لگی۔ میرے مسٹ است کا دم تویر سانپنی پی گئی لوگو، یہ جو میری بھتیجی ہے، میری بھوڑے ہے میرے بیٹھکی قاتل ہے۔“

مشی اللہ یار بیر واقعہ سننا چکا تو رازداری کے لیجے میں بولا ڈھرمان جس کا بیٹا اس کی بھوئے پسلے مر جاتا ہے بھوکو یعنی طعنہ دیتی ہے، اور بھر بانو بیچاری تو سیدھی سادی فرمانبردار اور بے زبان بھوئے، میرا خیال ہے کہ مست است پر جتن نہیں آتے بختے، بیگماں آتی تھی۔ لیکن وہ میراثی تھا اندر ہی اندر بھغارہ۔ بات زبان پر لانا تو قلتے اڑ جاتے، سودہ مسودوں کے باخھوں مرلنے کے بھائے اُس نے اپنے آپ کو مار ڈالا۔ اور میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اس کی موت کے بعد بیگماں اپنی ڈیوڑھی کے دروازے پر آتی اور مست است کے کونٹے کی طرف دیکھتے ہی اس کا رنگ نقش ہو جاتا مگر وہ دیکھتی رہتی، یونس کچھ یوں خوف زدہ نظر آنے لگا، جسے اُسے ایسے گھٹاؤپ ہدھیرے میں لا کر چھوڑ دیا گیا ہے، جہاں بلی کی آنکھیں بھی پیٹتے کی آنکھوں کی طرح چکتی ہیں، بڑی مشکل سے بولا ڈھکیا آپ کو اتنے بڑے گاؤں میں میرے لئے ہی مکان مناسب لنظر آیا تھا یار صاحب؟

”نہایت غیر مناسب جگہ ہے،“ مشی اللہ یار بڑی عاجزی سے بولا ڈھردوں کا موسم ہے جب باہر کھیتوں میں رات دن گزارنے والے کسان بھی اپنے گھروں میں اٹھ آتے ہیں۔ ہمیڈ اسٹر صاحب کو بھی یہ مکان ناپسند ہے۔ مگر میں نے کہا پڑھا لکھا انسان اپنا احوال آپ نالیتا ہے، میں کسی دوسرے مکان کی کھوچ میں رہوں گا جب تک اسے ترچھپانے کی ایک جگہ سمجھ لیجئے، بھر بی میراثی بڑتے تابعدار بڑے بے ضرر لوگ ہیں، ڈھنوں شہنمائی کی آوازیں البتہ آپ کو پریشان کریں گی مگر۔“

انتہے میں ہالوستی کا کٹورا ہاتھ پر رکھے آئی اور بسم اللہ کہ کراں سے یونس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ کٹورا لیتے ہوتے یونس نے بازو کو آنکھ بھر کر دیکھا اور کٹورا چکک کر رہ گیا۔ ”بسم اللہ بسم اللہ“ کہہ کر ہالو نے اپنے میڈے چکٹ دو پیٹے میں یونس کی شلوار پر گئے ہوتے لئے کے چھینٹے کو جذب کر لینا چاہا۔ وہ ”نہیں نہیں کوئی ہرچ نہیں،“ کہتا رہ گیا،

مخلج بہاؤ دو پڑے کا پوسنچال کر سیدھی کھڑی ہو گئی تو دو پڑے کامیل ٹوپنچ کی جگتی ہوتی شوار کے بھیگے ہوتے حصے پر مشتمل ہو چکا تھا یہ کوئی ہرج نہیں معمولی بات ہے اس نے بازو کی گھبراست کم کرنے کے لئے کہا اور پھر انہی گھبراہٹ کم کرنے کے لئے لستی کا اتنا بڑا کٹورا ایک ہی سافن میں غٹ غٹ پڑھا گیا۔ آخری گھونٹ پر اُسے خیال آیا کہ اُس نے نمشی اللہ یار کا حصہ بھی پی لیا ہے ملک پھرے سے کٹورا بافو کے حوالے کر دیا۔ بازو واپس چلی گئی۔

نشی اللہ یار بولا یہ بافو کو آپ نے دیکھا، اگر کسی صاف ستری دھملی دھلانی خورت کا ایسا ہی ناک نقشہ ہو تو کیا کوئی خورت اس کے سامنے سے نظریں جھکاتے بغیر گزرسکے گی؟ مست است کے بعد کسی نے اسے لکھی کہتے ہوئے بالوں اور دھملے ہوئے کپڑوں میں نہیں دیکھا۔ اسی لئے دوگ اب یہ بھی کہنے لگے ہیں کہ بافو پر بھی جتنی آنے والے ہیں۔ وگوں کو یقین ہے کہ مست است کو اس کے جن نے مارڈا لائے اور اب بھی راتوں کو اس کوٹھے سے شہنائی اور ڈھول بھنے کی کواںی آتی ہیں، جو اچانک شروع ہوتی اور اچانک تھم جاتی ہیں اور پھر ٹوٹتی رات تک گاہ دن کی اندر ہیری گلیوں میں کوئی سکنا اور کراہتا گھومتا رہتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ڈھول اور شہنائی ان سکاروں میں رکھتے ہیں اور اب بھک کسی نے انہیں نہیں چھوڑا۔ یہیں نے ابھی کچھ دیر پہلے اڑکوں کو کوٹھا صاف کرنے کو بھیجا تھا۔ صفائی تو دہ کر گئے ہیں۔ مگر کہتے ہیں انہوں نے تلاکھو لا تو ان کے پیسے نکل گئے، پھر اندر کوٹھے میں وہ جس گوشے میں بھی گئے کوئی انہیں اپنے قریب لمبی لمبی سانیں لیتا محسوس ہوا۔ بعد میں باز فرش پر پانی پھر کئے آگئی تو ان کی جان میں جان آتی۔ ادھر نوران نے بافو سے کہا، کہ ایک ایک چتن سب پڑھا کوڈی یہ کو پکڑ کر کھلنے کے لئے دے دو، یہ بھی کیا یاد کریں گے کہ میرا شیوں کے گھر آتے تھے۔ اس پر سب ہنسنے شہے، اور

یوں ان کا خوف دُور ہوا۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کیا جاتے ہے؟“  
 ”کوئی بات نہیں“ یونس کوستی کے کٹورے نے کافی ٹھنڈا کر دیا تھا۔ جنات سے  
 گپیں رہیں گی، وقت اچھا کٹ جائے گا۔“  
 غشی اللہ یار بڑے اطمینان کی ہنسی ہنسا۔ مجھے معلوم تھا آپ ایسا تعلیم یافتہ  
 آدمی ان وہموں کو خاطر میں نہیں لاتے گا۔“  
 دو فوں سکول جانے کو اٹھنے بی تھے کہ بازوستی کا ایک اور کٹورا لئے آگئی اور اسے  
 غشی اللہ یار کے ہاتھ میں تھما کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ ہتم نے توحد کر دی بازو۔ غشی  
 اللہ یار اس مدارات سے واقعی تجھرا گیا تھا۔ یہ کیا بات ہوتی کہ تم ہمارے لئے مجھے تجھر  
 سے لستی ڈھوتی پھر د۔“

یونس فوراً بولا۔ ”پہلے آپ کا حصہ میں پی گیا تھا نام۔“  
 ”اب ان کا حصہ آپ پی جائیے“ بازو نے غشی اللہ یار سے کہا۔  
 تینوں ایک ساتھ ہنسے اور باہر سے بوڑھی نوران کی آواز آتی۔ ”اے بالو مجھے  
 بھی بتا کیا بات ہوتی، کیس کوئی جن تو نہیں سکر دیا منشیوں نے؟“  
 ”اسد تو بہت ہے۔“ یافو نے سمجھیدہ ہو کر کافوں کو ہاتھ لگالئے اور کٹورا لے کر  
 کوٹھے سے باہر نکل گئی۔

سکول میں چھٹی کے بعد جب یونس گھر کی طرف روانہ ہوا تو اُسے کچھ ایسا لگا  
 جیسے وہ جیتی جا گئی دنیا سے عالم ارداج کی طرف جا رہا ہے اُس نے دوستوں کی محفل  
 میں جنات کے وجود سے ہمیشہ نکار کیا تھا، میکن آج دن دہاڑے جنات جیسے اس کے  
 سر پر منڈ لارہے تھے اور اُس کے کندھوں پر سے جھاک رہے تھے۔ یہ خیال بھی  
 اُسے لئے ڈالتا تھا، کہ اسے سوتے کے لئے جو پنگڑی دی گئی تھی وہ بازو کی شادی کی

پنگڑی تھی اور مست است نے اُسی پر دم توڑا تھا۔ اسے فرشی اللہ بار پر بڑا غصہ آ رہا تھا جس نے اُسے اس جہنم میں لاڈا لاتھا، جہاں ایک طرف سمجھماں کا آگ کی طرح بھڑکتا ہوا حسن تھا، دوسری طرف میلی کچیلی بافو اور ٹوٹی پچھلی نزاراں تھیں اور درمیان میں جنات سے بھرا ہوا کوٹھا تھا تھا جہاں مست است کے بعد ساس بُھونے ایک رات بھی بسرنہ کی، مگر ایک غریب پر دیسی اُستاد کے لئے اُسے ڈیرہ دروپیہ ماہنہ کرتے پر اٹھا دیا۔ لائچ بُری بلائے، اس نے سوچا، اس لائچ نے سمجھماں کے حسن کو خوانی کے طشت میں سمجھے ہوئے تباشوں کے ڈھیر میں بدی دیا ہے۔ اور جو جوانی سے بالب بھری ہوتی ہا نو ایسی عورت کو شادی دالے گھروں میں صرف ایک دوئی چوں کیتے بھک مٹکوں کی طرح رات دن گانے بجانے پر مجبوڑ کرتا ہے اور جو ایک بڑھیا کے دل میں جس کا انکوتا نوجوان بیٹا مرجھکا ہے، اس خیال کو پھٹکنے نہیں دیتا کہ جس آدمی کو اُس نے اپنا مکان پنگڑی سمیت ڈیرہ دروپیہ ماہنہ کرنے پر دے دیا ہے، وہ بھی نوجوان ہے اور وہ بھی ایک ماں کا بیٹا ہے۔

یونس اس ارادے سے اپنی لگبھی میں مڑا کہ وہ سمجھاں کی طرف تسلکھا اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔ مگر سمجھماں کا دروازہ خالی تھا۔ اُس نے اطمینان کی ایک سانس می اور لپا کر میراثیوں کے صحن میں آگیا تو نہ پھرپڑ کے پاس اُسے فوراں دکھانی دی نہ چولھانے میں اُسے باfonظر آئی، اُس نے چالی تارے میں ڈالی تو مالا اُسے موت کی طرح ٹھنڈا محسوس ہوا۔ ایک دم اس پر خوف سوار ہو گیا، یہ سب کم بخت کہاں غائب ہو گئے، دن کو جو نیک دھرنگ پچھے اُس نے دیکھے تھے وہ سب کہاں اُڑ گئے، مندرجہ دن پر سے چڑیاں تک غائب تھیں۔ ہر طرف اُتو بول گیا تھا۔

اس نے تارے میں چالی گھنادی۔ کوڑ کی ایک چوں خاصی بھاری آواز میں بولی۔ ”آئیتے؟“ وہ گھبر اگی۔ مگر پھر مسکرا نے لگا۔ ہمت باندھ کر اندر دیکھا تو چوت کے

بادریہ میں سے سورج کی روشنی اب چھ سات دن کا چاندن کر اس دیوار پر چک رہی تھی۔ جس کے ساتھ رنگین پنگڑی رکھتی تھی۔ ایک بھونرا چھت کی ایک ایک لکڑی کو سونگھتا پھر رہا تھا اور اُس کے پروں سے ایسی آواز آرہی تھی جیسے کہیں دُور ہوئی جہاز اُڑ رہا ہے۔

کچھ سورج کر اُس نے سینہ مان لیا اور پنگڑی پر جا بیٹھا، مگر مشیختے ہی اٹھ کھڑا ہوا بیگماں دروازے میں کھڑی سامنے گلی میں دکھر بی تھی، یُونس اب کے آہستے پنگڑی پر بیٹھ گیا اور بیگماں کی یک رُخی تصویر دیکھنے لگا۔

ز جانے اتنے صاف رنگ پر سیاہ لباس پہننے کا اُسے کس نے مشورہ دیا ہے کہ کالے دوپٹے کا ہاشمہ بھی جگہ گارہا ہے۔ اُس کی تکھیں کتنی لمبی ہیں کہ کنپشیوں کے ہاروں تک آگئی ہیں اور اس کے ہونٹ کتنے حساس ہیں۔ بالکل گلاب کی پنکھڑیاں کہا تو بھر کی بلندی سے بھی متلی اُتی ہوئی گزر جاتے تو کیکپا کر رہ جائیں اور شھوڑی سے مڑتا ہو تو اخط کتنی لمبی گردن بنا آتا ہو اس کے دونوں کندھوں پر بکھر گیا ہے —

یکجاں کیک بیگماں پٹ کر یُونس کو دیکھنے لگی۔ یُونس نے بھر اکر پنگڑی کے دائیں بائیں دیکھا، پھر اٹھ کھڑا ہوا اور بیگماں تالی بھاکر اُتی بے اختیاری سے ہنسنی کو اگر وہ پر دیں میں نہ ہوتا تو اُس عورت کو ڈانٹ دیتا پھر وہ اندر چلی گئی اور خوشبو کا ایک جھونکا میسے یُونس کے کوٹھے میں چلا آیا، ادھر سے بافو تیز تیز قدموں سے آنگن طے کرتی ہوئی بیگماں کے دروازے کی طرف بڑھی۔ دہل اُسے نہ پا کر یُونس کے کوٹھے کی طرف دیکھا اور اندر چلی آئی۔

”آذ بھتی بازو کیسی ہو؟“ یُونس نے پوچھا۔

”چھٹی ہو گئی منشی جی؟“ ہاذنے پوچھا۔

”ہاں!“ دُوہ بولہ۔

”ادھر گئی میں کوئی زور سے ہنسا میں سمجھی بیگم لہنٹی ہے۔ میں نے کہا جلنے کیا  
بات ہے۔ باہر آئی ہوں تو گلی خالی ہے، جانے کون ہنسا تھا؟“ بانو نے سوال نہ پوچھتے  
ہوتے بھی سوال پوچھا۔

یونس بولا ہے تو مجھے معلوم نہیں کہ کون ہنسایا کوئی ہنسا بھی کہ نہیں مگر قسم ہنسی کی آواز  
سُن کر اس طرف کیوں بھاگیں؟ یونس نے ٹوہ لگانی چاہی۔  
”بھی ذرا سا ہنس لینے کو جی چاہا۔“ بانو نے جواب دیا۔ ”اکیلا آدمی ہنستا بھی تو بھلا  
نہیں لگتا۔“

یونس کے تیور تباہ ہے تھے کہ بانو نے وہ الفاظ کرنے سے انکار کر دیا ہے جو وہ  
اس سے کہوانا چاہتا تھا۔

باوجاتے ہوتے دروازے پر ذرا ساری اور پیٹ کہ کچھ کہنا چاہا۔ مگر پھر جیسے  
اراودہ نہ سخ کر دیا اور حلپی گئی۔

اور یونس پنگڑی کو سکاروں کی طرف کھینچ کر اس پر کچھ ایسے رُخ سے بیٹھ گیا جیسے اگر  
اس کی نظر دروازے کی طرف اٹھ گئی تو بیگمان تالی بیجا کر قہقہہ مار دے گی۔

شام سے کچھ دیر پہلے غشی اللہ یار آیا اور یونس کو کوٹلے کے ایک گوشے میں  
دیکھا ہوا دیکھا تو بولا۔ ”لا حول ولا قوہ پنگڑی ادھر کیوں گھسیٹ لاتے۔ بیہاں تو آپ  
شہر جائیں گے۔ ادھر دیکھنے دروازے پر دھوپ اب تک چک رہی ہے اور پھر  
دروازے میں سے آپ کم از کم آسمان تو دیکھو سکیں گے۔“

یونس پنگڑی سے اٹھا اور بولا۔ ”اس عورت کا نام بیگمان سے آسمان کب سے  
ہو گیا؟“

غشی اللہ یار چون کہا تو یونس بولا۔ ”بھتی یار عاصم، بات یہ ہے کہ دروازے  
میں ہر وقت وہ عورت عطر کی دوکان لگاتے کھڑی رہتی ہے اور یہ کچھ اچھا نہیں لگتا۔“

”کیا اچھا نہیں ملتا؟“ منشی اللہ یار نے مسکرا کر پوچھا۔ ”عورت کا کھڑا ہونا یا عورت کو دیکھنا؟“

”دونوں“ یوں یوں ناگواری سے بولا جیسے ماسٹر اللہ یار کو پتہ ہے کہ بیگماں نے ابھی ابھی اپنے قہقہے کا چاکب مار کر یوں کی کمر دہری کر دی ہے۔ مگر منشی اللہ یار اپنی وہن پڑاڑا۔ وہ پلنگڑی کو گھسیت کر اس کی پرانی جگہ پر لے آیا اور بولا۔ ”بیگماں کا نظر آنا نہ آنا آپ کے لئے برابر ہے، گاؤں کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ وہ آپ کی طرف یا میری طرف یا کسی اور کی طرف نہیں دیکھتی۔ وہ صرف ایک ہلفت دیکھتی ہے بس یہ کہ آدمی اُس کے تیروں سے گھبرا جاتا ہے۔“

پھر منشی اللہ یار نے یوں کا بستر کھول کر پلنگڑی پڑھایا، سکاروں اور درد ازوں پر کنڈوں اور کیلوں سے کپڑے لٹکاتے اور پر و گرام کے مطابق اسے گاؤں سے باہر گندم کے لمباتے کھیتوں میں لے گیا۔ سورج افني میں آدھا پیوست ہو چکا تھا۔ گھروں سے نکلا ہوا دھوان ایک مرٹا میلا سا گدا بن کر گاؤں پر پھیل گیا تھا۔ تھکے ہائے چردا ہے مویشی کے گلوں کے چھپتے چھپے لمبی سوتیاں گروں پر رکھے اور ان کے پیچے سے دونوں ہاتھے جا کر دن بھر کے لکھتے ہوئے بازوں کو سہارا دیتے جا رہے تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ ان کے بھتے بدرنگ سُکتے تھے، جو اپنے اُس پاس کی ہر چیز کو سونگھتے ہونے جا رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے تو یوں کے کترانے کے باہم دو اس کی شلوار کا پائیچہ سو بگھیا۔ درختوں پر چڑیوں نے ہیجم چار کھنچی پھر لیکا۔ ایک چھدرے چھدرے بادلوں سے ڈھکا ہوا آسمان مقبرے کا سنہری گنبد سا بن کر چکا تھا۔ ہوا تیز ہو گئی جیسے اسی لمبے کے انتظار میں تھی۔ مگر اس تیزی نے گندم کے کھیتوں میں جو مسلسل اور متوازن سرسر اہست پیدا کی، اُس نے منظر پر خاموشی کی تھیں چڑھا دیں۔ سنائما اتنا شدید ہو گیا کہ یوں کو ایسا لگا جیسے وہ ہبانک برا ہو گیا ہے۔ ”یار صاحب“ وہ اپنی

ساعت کو آذان کرنے کے لئے بولا۔ مگر اُسے اپنی آواز بھلی کی کڑک کی طرح سنائی دی۔  
”جی!“ فرشتی اللہ یار نے کہا۔

اور یونس پتوں کی طرح بولا۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔  
”فرشتی اللہ یار رُک گیا۔ اس نے یونس کے کندھے پر ہاتھ دکھ کر وہاں کا گوشت  
اپنی گرفت میں لے کر چھوڑ دیا۔“ مدد کرتے ہیں آپ نہ وہ بولا۔ مجھے اس وقت ایک شعر  
سوچ رہا ہے اور آپ کو ڈر لگ رہا ہے۔ کمال کرتے ہیں آپ نہ پھر اس نے پُنے  
آسمان پر ہاتھ گھما کر پوچھا۔ آپ کو اس خوبصورت غیرزمینی لمجھ سے ڈر لگ رہا ہے؟  
یونس گھبر سا گیا۔ غیرزمینی محمد! امدادی محمد! روؤسیں اور جنات! مست است  
اور بانو! —

”بانو، تم کہاں؟“ فرشتی اللہ یار کی آواز آئی اور یونس چھینا پہنچا رہ گیا۔

منظر کے ماند پڑتے ہوتے سنہری پن میں بانو بالکل غیرزمینی خلوق معلوم ہو رہی تھی۔  
بالکل ان دیلوں کی سی تصویر جن کے گرد ہالا بن کر مصودہ اُن کے نقوش کو صرف اس لئے  
وہندہ لادیتے ہیں کہ آسمان کوئی وقت سے پہلے نہ ٹوٹ پڑے۔ بانو کا رُخ مغرب  
کی طرف تھا۔ جہاں سورج ڈوب چکا تھا اور اب اپنے بادے کے سنہری اور سرخ  
گوشے پمیٹ رہا تھا۔ تیز ہوا کا رُخ مشرق کی طرف تھا۔ جہاں رات جنم لے عکی تھی  
اور منظر کچلا گیا تھا۔ مجھتے ہوتے اجاءے نے بانو کے نقوش کی دربانی غیریقینی حذر  
بڑھا دی تھی اور تیز ہوانے اس کے جسم کی تراش کو پوری تفصیل کے ساتھ نمایاں  
کر دیا تھا۔

”میں کھڑیاں پُختے گئی تھی،“ اس نے کہا اور جیسے سورج نے ایک جھنک کے  
ساتھ اپنے انجام کو سکیٹ لیا۔ شام بیکا یک سیاہ پر گئی۔

بانو کے سر پر ہاتھ سے توڑی ہوئی۔ مکڑیوں کا گٹھا تھا، جسے اس نے دونوں ہاتھوں

سے تھام رکھا تھا۔ ”گھومنے نکلے ہو؟“ اُس نے پوچھا۔  
”ہاں!“ یونس نے احول کا خول توڑ کر باہر نکلا چاہا۔ ”یہ گھوم رہے ہیں، اور  
مجھے گھما رہے ہیں۔“

باز ہنسی، یہ ہنسی بیگان کی ہنسی سے سراسر مختلف تھی۔ یونس نے سوچا۔ بیگان  
کے تھق چاک کی طرح مڑاپ مڑاپ برستے ہیں۔ باذکی ہنسی ہنور کے رنگ برستے  
بنٹوں کی سی ہے جو پتیل کی پلات میں گردے ہوں۔

”گھوموا در گھما و!“ بافوں اسی طرح ہنستی ہوئی بولی اور چل دی۔

یکاکیک یونس کو خیال آیا کہ ہنسی اللہ یار جو آج دوپہر کو ذرا ذرا اسی بات پر ہنس  
رہا تھا۔ اس وقت کبھیوں نہیں ہنسا۔ یار صاحب! اُس نے کہا۔

”جی!“ ہنسی اللہ یار جیسے نیند سے چونکہ پڑا۔

کیا اب آپ کو ڈر لگ رہا ہے؟ یونس نے پوچھا۔

”ڈر!“ ہنسی اللہ یار بولا۔ پھر اُس نے دُور مغرب کے سُرمنتی افق پر بازو کے  
کاعل ایسے ساتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”قسم کھا کر کہیے یونس صاحب!  
کیا آپ نے باذکی سی عورت کیں دیکھی ہے؟“

یونس بولا۔ ”اگر میں بھجوٹ بول دوں کہ ہاں دیکھی ہے تو آپ کیا کریں گے؟“

”میں خود کشی کر دوں گا!“ ہنسی اللہ یار بھراتی ہوتی آواز میں بولا اور پھر یونس

سے لپٹ گیا۔

اور یونس کو یوں محسوس ہتوا جیسے اس پر چن آنے والے ہیں۔

عشاکی اذان کے بعد جب ہنسی اللہ یار ناشاد، یونس کو اپنے ہاں کھانا کھلا کر  
اور اپنی روتنی ہموئی غزل میں نشانہ کرنا تھا میں لاثین لٹکاتے اُسے ٹھہر جھپٹوڑ نے

آیا تو گلیاں سنان ہو چکی تھیں۔ گھروں کے بندروں اذوں سے ادھر کسی کسی پیچے کے رونتے کی آواز آجاتی یا مردی سے ٹھنڈتا ہوا کم ملتا یونہی روایتی میں چودھویں کے چاند کی طرف نہ اٹھا کر جو نہ کرتا، اپنی گلی میں مٹتے ہی یونس کی تظریں بیگماں کے بند دروازے سے ٹکرا گئیں، پھر اشیار بولا۔ ”لو بھنی یونس عاصب ہم چلے۔ یہ لالثین لے پہنچے، جعل لمحہ بگا۔“

یونس مشی اللہ یار کی جھججک کا مفہوم سمجھ کر بولا۔ ”خدا ہما فنا، شب بخیر۔“  
مشی اللہ یار کوئی جواب دیتے بغیر لاٹھیں تھما کر پیٹ گیا، اور جب اس کے ٹھدوں کی آواز بھی بند ہو گئی تو یونس پر چاندنی رات کا آسیب مُسلط ہونے لگا۔ خون سر میں جمع ہو کر گو بخنے لگا۔ اس کے کاذن کے پاس پھٹا ہوا ڈھول بخنے لگا۔ پھر اُسے چینیت ہوتی شہنائی اُس کی آواز بھی ستائی دے گئی اور کسی کی گرم گرم سائیں اُسے اپنی گردن پر محسوس ہونے لگیں، وہ تڑپ کر پلٹا مگر وہاں کچھ نہ تھا۔ یکاکپ اُسے خیال آیا کہ اگر بیگماں اُسے یوں بکھلاتا ہوا دیکھ لیتی تو کتنے زور سے قمقہ مالتی۔  
پھر اس نے اپنے آپ کو یاد لایا کہ اُس کے سُوٹ کیس میں بی۔ اے کا ڈپو ما رکھا ہے اور وہ انگریزی کا مسلم ہے، اور جنات صرف ان پڑھ دہمیوں ہی کی تاک میں رہتے ہیں۔ ذرا سا سنبھل کر اُس نے کوٹ کی جیب میں سے کجھی نکالی اور آگے بڑھا مگر ابھی میراثیوں کے آنگن میں مڑا ہی تھا کہ بیگماں کا دروازہ بکھلا اور ساتھ ہی خوشبو سے لدا ہوا ایک بھونکا یونس پر اٹھ پڑا، بیگماں کی آواز آئی۔ ”کون ہے؟“  
”میں ہوں۔“ دہ فوراً بولا۔

”میں کون؟“

”ماستر یونس!“ اُس نے جواب دیا۔

”ہم تو ڈر گئے تھے،“ بیگماں بولی۔ ”ہم سمجھے کوئی چور ہے یا کوئی جن ہے، دیسے پاؤں

کیوں چل رہے ہو یہ جوان آدمی ہو جو انوں کے قدموں میں تو بڑی دھمک ہوتی ہے۔  
وہ ذرا سارہ کا، مگر اُسے کوئی جواب نہ سُوجھا۔ پھر خود بیگماں ہی نے کواڑ بھیر لئے  
تو اُس نے بڑھ کر اپنے کوٹھے کے تالے کو پکڑ دیا۔ تالا برف کا گولا ہورتا تھا۔ اُس نے  
جلدی سے کنجی گھمانی اور کواڑ کھوئے۔ ایک کواڑ کے قلابے میں سے  
کچھ ایسی آواز آئی جیسے کوئی آدمی بولا ہے۔ ”آئیے!“

وہ لرز کر رہ گیا۔ مگر پھر اُسے خیال آیا کہ کہیں بیگماں دروازے کو نیم وا کر کے  
اس کا مطالعہ نہ کر رہی ہو اور اس خاموش رات میں تو اُس کا تھقہ ساری دُنیا میں  
گوئیج جانتے گا۔ کوٹھے میں داخل ہوتے ہی اُس نے دیا سلاطی جلانی اور اس کا اتنا بڑا  
ڈولنا ہوا سایہ فرش، دیوار اور چھپت پر کھیل گیا۔ لاٹین جلا کر اُس نے دروازہ بند کر دیا،  
اور پنگڑی پر گھر پڑا، مگر دیوں کو دکر اٹھ دیکھا جیسے مست است کی میت پر گرا تھا۔ مگر  
جلکر وہ ادھر ادھر ٹلنے لگا۔ لاٹین کی روشنی میں اس کا صایہ دروازے پر سے یوں  
بار بار گھن رجاتا تھا جیسے پھر دے رہا ہے، پھر سوٹ کیس کھول کر ایک کتاب نکالی اور  
پنگڑی پر لیٹ کر پڑھنے لگا۔ پڑھتے پڑھتے اُسے محسوس ہوا جیسے اس کے چاروں طرف  
کوئی لمبی لمبی سائیں لے رہا ہے اور جیسے سکار کے اندر پھٹے ہوتے ڈھول پر کسی  
نے ہاتھ مارا ہے، اُس نے گھبر کر ادھر ادھر دیکھا اور مسکرا کر اپنا سر جھٹک دیا، وہ  
غائب کی ایک غزل لکھنا نے لگا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر اس نے لاٹین بھجا دی، آنکھیں بند  
کر دیں۔ وقفہ وقفہ سے کر دیں بہنسے کے بعد وہ چھت لیٹ گیا اور غائب کی غزل کا  
یہ مصرع بار بار لکھنا نے لگا۔

پڑھے ساتے کی طرح میرا شستان مجھ سے

اس کا خوف آہستہ آہستہ دُور ہونے لگا اور وہ سو گیا۔

نیند میں اسے کچھ ایسا لگا جیسے کوئی اس کا لحاف کھینچ رہا ہے، اس کی آنکھ

مکھل گئی یہ محسوس کر کے اسے بڑا طیناں ہوا کہ اس کے لحاف کا آخری سراہی ہیں اس کی ٹھوڑی کے نیچے ہے جہاں سوتے وقت تھا اور کمرے میں سوانے اس کے کوئی نہیں ہے، وہ پھر سے دہی مصروف یون گنگانے لگا جیسے اُمِ عظیم کا درد کر رہا ہے۔ ۷  
پڑھے ساتے کی طرح میرا شبستان مجھ سے

اچانک اُسے محسوس ہوا کہ اس کے شبستان میں اس کے خلاودہ کوئی اور بھی ہے، یہ چاندنی تھی جو دوسرے دروازے کی چھپڑیوں میں سے لمبی سیدھی تیلیاں بنی فرش پر منقش تھیں۔ اچھا تو وہ اتنا بہت سا سو لیا تھا کہ چاند جو مشرق سے نکلا تھا۔ آدھا آسمان طے کر کے مغرب کی طرف کھلتے ہوئے دروازے کی چھپڑیوں میں سے جھانکنے لگا تھا، تو پھر اب صبح تو خاصی قریب ہو گی۔

اچانک چاندنی کی تیلیاں بکھر گئیں، مگر پھر چپ اٹھیں اور یونس کو یقین ہو گیا کہ اس کے دروازے کے سامنے سے کوئی گزر رہے، کون گزر رہے؟ اس وقت کون ہے جسے یہاں سے گزرنے کی خردت محسوس ہوئی۔ دروازے کی چھپڑیوں کا ایک بڑا حصہ پھر سے بچھ گیا اور بچھا رہ گیا۔ وہ بچھ اٹھا۔ کون ہے؟ "سا یہ ہٹ گیا اور یونس نے لپک کر دروازے کی کنڈی کھول دی۔ آئیے" دروازہ بول اور چاندنی جیسے کوڑوں کا بند توکرے اندراں پڑیں۔ یونس نے آہستہ سے باہر قدم رکھا اور یون بولا جیسے اپنے قریب ہی کھڑے ہوئے کبھی غیر مردی وجود سے برگوشی کر رہا ہے۔ "کون ہے؟" کوئی جواب نہ پا کر دہ گھی میں آیا۔ سیگیاں کی ڈیورھی کے بند دروازے کو دیکھا، گھی میں جھانکا، پلٹتھے ہوئے اس نے ذرا دایس ہر کوئی میراثیوں کے گھروندوں پر نظر والی جو قبروں کی طرح ایک دوسرے میں گھٹے ہوئے کھڑے تھے۔ صحیب بات ہے؟ اُس نے زیر دب کھا اور کوئی نہیں اُسکر دروازہ بند کرتے ہوئے دک گیا اور دروازہ گھلارہنے دیا اور پنگڑی پر دایس کر دیٹ کوئیٹ کر دروازے میں سے باہر دیکھنے لگا۔

اسے مشی اللہ یار یاد آگیا۔ اگر وہ بانو سے پیار کرتا ہے تو اس کا انعام کیوں نہیں کرنا ہے بانو داعی بڑی پورا سرار عورت ہے، اچھی نظر سے دیکھو تو دیکھنے رہ جاؤ، اس کے نقوش تکمیل کی طلب ہی محسوس نہ ہو اور جزو داخور سے دیکھو تو دیکھنے رہ جاؤ، اس کے نقوش تکمیل کی انتہائی تفصیلوں تک مکمل ہیں۔ مگر کھلی خشک میں لٹیں دھجیوں کی طرح لٹک کر آنکھوں اور منہ میں پڑ رہی ہیں۔ کروتے میں کوئی چار جگہ تو پہنچ لگے ہیں۔ اس کے ہاتھ کتنے میلے ہیں اور میلے ہیں تو کھڑرے بھی ضرور ہوں گے۔ پاؤں بالکل حیوانوں کے سے ہیں، پھیلے ہوئے پنجے اور پھٹی ہوئی اڑیاں، پھر وہ ان کڑاکے کے چاڑوں میں بھی نگکے پاؤں رہتی ہے۔ اس کا زنگ یقیناً صاف ہو گا۔ اس کی گروں سے ذرا نیچے کا حصہ جو کرتے کے ہن کے قریب نظر آتا ہے کتنا صاف تھا، چاندنی کا سامبی ہی اس کا اصل زنگ ہو گا۔ چھرے کا میدا سانو لا رنگ اس کا اصل زنگ نہیں ہے۔ ممکن ہے وہ دو تین دن تک انگریزی صابن سے ہاتھ دھو لے تو یہ میل اتر جائے۔ مشی اللہ یار سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا کہ اسے صابن کی اک بیٹی ہی لادے۔ محبت کرنے والوں کی یہ قسم بھی عجیب ہوتی ہے کہ فرائی محبوب میں زار زار رہ لیں گے۔ مگر محبوب پر ایک اکٹی خوش کرنے کی انسیں تو فیض نہیں ہو گی۔ یونس نے سوچا۔ کل وہ مشی اللہ یار کی محبت کو غیرت دلاتے گا۔ مخدودہ تو کرتا ہے کہ بانو کو وہ آخر دم تک نہیں بتائے گا کہ وہ اس سے پیار کرتا ہے۔ اس لئے کہاں صرف مشی اللہ یار محرومی کی آگ میں مجبس رہا ہے۔ پھر بانو بھی اسی جہنم میں جھونک دی جاتے گی۔ کیونکہ دونوں کو معلوم ہو گا کہ۔ ”ہم“، مشی اللہ یار نے کہا تھا۔ ہم سماجی مقامات کے کھوٹوں کے ساتھ کتوں کی طرح پندھے ہوتے ہیں اور ہم زنجیر توارکر بھاگیں گے تو اوارہ کملائیں گے۔ یہ کسی رٹی ٹماٹی کتابی محبت ہے یونس نے سوچا اور ادھر مشی اللہ یار ہر سال ایک نئے بیٹے کا باپ بھی بن جاتا ہے اور یہ بھی دیکھتا رہتا ہے کہ بانو دوسری

میراثنوں کے ساتھ صرف ایک دولی چوٹی کے لئے دن بھر ڈھونک کوٹتی ہے اور جگہ  
چھاڑ پھاڑ کر گاتی ہے اور جب وہ دہن کی آمد کے بعد سب میراثنوں کے ساتھ چند  
ہمیوں کی خاطر بھکاریوں کی طرح اتحاد پھیلاتے، وہاکے باپ کا تعاقب کرتی ہے تو  
اس کے جسم کے تناسب کے مقابلے میں اس کا یہ غیر مناسب انداز کتنا بھوٹا، کتنا  
چھوٹا معلوم ہوتا ہے۔ «مگر بے چاری کرنے بھی تو کیا کرے!» مشفی اللہ یار نے کہا تھا۔  
وہ اگر میں اسے ہر سینے پانچ دس روپیہ دے دیا کروں تو میری بیوی کو کافیں کافی بھرنے  
ہو گی، مگر بازو کی پچھوپی تو اس سے پوچھنے گی کہ یہ دست غیر کاگر تو نے کس مردے  
سے سیکھا۔ اور اس کی پچھوپی کو یقین ہے کہ بازو، چڑیل ہے، صرف اس کے پاؤں پچھلی  
طرف مڑنے سے رہ گتے ہیں۔ وہ کہتی ہے، مست است کو یہی چڑیل نچوڑ کر پی گئی۔ وہ  
اسے گالیاں دیتی ہے اور کوستی ہے۔ مگر ساتھ ہی اسے بھلاقی بھی ہے کہ اگر بازو کیسیں  
ادھر ادھر ہو گئی تو کمیں وہ روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کے لئے محتاج نہ ہو جاتے ہیں  
یہ سب کچھ دیکھتا ہوں اور کھڑھتا ہوں اور خُرُن جگہ پیتا ہوں۔ میں اس سے زیادہ اور کمر  
بھی کیا سکتا ہوں یونس صاحب!

مشی اللہ یار کی باتیں یاد کر کے یونس کو ہنسی آگئی، عجیب بوداعشق ہے!  
چاندنی میں کوئی گلی کی طرف سے آیا اور بیگماں کے بند دروازے کے پاس  
لُکے بغیر اندر چلا گیا تو کیا بیگماں کا دروازہ کھلا تھا!

وہ بخوبی پہنے بغیر باہر لپکا، اور میراثیوں کے گھروں کو بیگماں کے گھر سے جدا  
کرتی ہوتی پست حد بندی کے پاس جا کر اس نے دیکھا کہ بیگماں ایک آدمی کے ساتھ  
صحن کوٹے کر کے دروازے تک پہنچی، اپھر اس نے دروازہ کھولا، دروازے  
کے بالکل سامنے ایک دیا جل رہا تھا۔ دلوں اندر چلے گئے، دروازہ بند ہو گیا اور  
دیا بخوبی گیا۔

وہ دروازے کو اتنی دیر تک گھورتا رہا کہ دروازے میں حرکت پیدا ہو گئی اور جس حد بندی پر وہ کہنیاں رکھے کھڑا تھا۔ وہ نیچے دھنے لگی۔ پیچے ہٹ کر اُس نے سر جھکھکا۔ واپس اپنے کوٹھے میں آیا تو اس کی سانس بھپول رہی تھی اور جسم تپ رہا تھا۔ پھر اُسے کچھ ایسا لگا جیسے کوئی اُس کے کھلے دروازے کے سامنے سے شپ سے نکل گیا ہے، یونس چونکا مگر پھر انکھیں ملتے ہوئے پینگڑی پر گرد پڑا۔ کاش خشی اللہ یار کیس آس پاس ہوتا تو وہ اس سے پیٹ جاتا۔

یونس بیچ کو خشی اللہ یار کے ہاں چلتے پینے گیا تو اُسے رات کا ساز او قلعہ سایہ  
”ڈاؤنچا ساقد تھا ہے“ اس نے پوچھا۔

”ہاں ہے“ یونس بولا۔

”بڑا ساطرہ تھا ہے“ خشی اللہ یار نے دوسرا سوال پوچھا۔

”نہیں تو۔“ یونس نے جواب دیا ”میرے خیال میں تنگ سر تھا، پینگڑی شاید اس نے بغل میں دبار کھی تھی۔“  
”پیچھی بغل میں ہو تو ظرہ سر پر نہیں ہوتا یہ خشی اللہ یار کو دل لگی سُوجھی۔ پھر بولا۔  
”راجہ ہو گا۔“

”راجہ ہے“ یونس نے حیران ہو کر پوچھا۔

”ہاں ہاں ہے وہ بولا۔“ آگیا ہو گا پر دیس سے بچپوٹے بھائیں کو کہیں نہ کر کر لئے گھیا تھا۔ بیگماں کو معلوم ہو گا کہ راجہ واپس آ رہا ہے۔ اسی لئے تو وہ اتنی چمک رہی تھی۔ بیس نے کہا تھا نا۔ بیگماں کو گراہ کہا جا سکتا ہے اُسے بد معاشر یا آوارہ کنا مشکل ہے۔ بس وہ عشق ایسے دھرتے سے کرتی ہے کہ آوارہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس کا شہر اس کے انہی تیور دن سے تنگ آگر کہیں بھاگ گیا ہے، بیچارے پار چڑھا فہیں۔

پھر جگہ جگہ کپڑے کے کارخانے لگ گئے تو کھڈی توڑ کر ہیں بنالیا، اور مزارعست  
شروع کر دی۔ سال بھر کا غلام کمایتے تھے، راجھ سے بیگماں کی آنکھوں پر کھیتوں  
میں لڑی ہے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ایک دن شوہرنے جو بیگماں پر فدا تھا،  
بیگماں کے تھپڑے مارا۔ تھپڑے کا بکارہ گیا۔ پھر منہ پیٹ کر گھر سے نکلا اور دو  
ڈھائی سال ہونے کو آئے ہیں؛ پیٹ کر نہیں آیا، کہتے ہیں اور ہر بلوچستان کی طرف سے  
ایران کی سرحد پار کر گیا۔ پہلے سال اس گاؤں کا ایک آدمی خلکی کے راستے جمع کرنے گیا  
تھا۔ اس نے اگر بتایا کہ بیگماں کا شوہر اُسے زہان میں سرک کے کنارے ایک پڑول  
پپ کے پاس ایک میلا سا چستیہڑا ہاتھ میں لئے کھڑا نظر آیا تھا۔ و اللہ اعلم۔ ادھر راجھ  
کے عشن کا چرچا ہوا تو بیگماں کا بھائی اللہ نواز تبرہ بخت ہیں لئے ہن کے گھر آیا اور قیامت  
مچا دی۔ پھر جب بیگماں نے اسے رو رو کر یقین دلایا کہ یہ سب دشمنوں کی کارستانی  
ہے تو اب اللہ نواز نے ہن کی خاطر سارے گاؤں سے لڑائی مول لے رکھی ہے بیگماں  
کی چال ڈھال میں اسی لئے تو یہ بلا کا ٹھسٹا ہے، میدان صاف دیکھ کر بڑے بڑوں  
نے قمرت آزمائیاں کی ہیں، مگر بیگماں نے سب کو ٹھوکر پہ اٹھا کر یوں اچھا لایا کہ  
سب منہ کے بل گرے ہیں۔ اب یہ سب دگ بیگماں کے جانی دشمن ہیں، مگر بیگماں ہے  
کہ چتوں پر بل ہی نہیں آئے دیتی۔ اپنی لگن میں مگن ہے، چار پانچ سال پہلے لڑکا  
ہوا مگر مر گیا، پھر شوہر بھی چلتا بنا جب سے اکیلی ہے مگر اکیلی معلوم نہیں ہوتی، ایکیے تو ہم  
جیسے ہوتے ہیں کہ گھر میں ہیوی ہے، نیچے ہیں۔ مگر باہر گلی میں آؤ تو جیسے پنجھرے ہیں سے  
نکلے ہو۔“

غشی اللہ یار ایک دم سنبھیہ ہو گیا، پھر بولا۔“ آپ بیگماں کی پرواہ کیجئے،  
اپنے نام سے کام رکھتے، آپ کو کیا اس کے پاس کون آیا کون گیا۔“  
”مجھے کیا؟“ یونس نے جیسے احتجاجاً کہا۔

”وہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ آپ کو کیا، لگھور سے پر بچوں کھلے یا گھا لوئے، آپ کو کیا؟“ فرشی اللہ یار نے یونس سے غُر میں ایک سال بڑا ہونے کا نامہ انھاتے ہوئے کہا۔ پھر انھاتے سے بولا۔ ”بالو کیسی ہے؟“

”میں نے تو اُسے کل گھنیتوں کے بعد سے اب تک نہیں دیکھا۔“ یونس نے جواب دیا۔  
فرشی اللہ یار فوراً بولا۔ ”ڈاکٹر اقبال صاحب تو کہہ گئے ہیں کہ یعنی

”ہے دیکھنے کی چیز اسے باہر بار دیکھو۔“

یونس مسکرا کر بولا۔ ”قو پھر دیکھو۔“

مگر فرشی اللہ یار رنجیدہ سما ہو گیا۔ پھر یونس نے اس خوف سے دہان سے اُنہے آنا چاہا کہ کہیں وہ کل کی طرح اس سے پشت کر رونے نہ لگے۔

وہ انھا مگر پھر بیٹھ گیا۔ ”یا ر صاحب، رات جنات کو تو میں نے خوب پکڑ دیتے

اور خوب منے سے سریا مگر۔“

”میں نے تو جان بوجھ کر جنات کا ذکر نہیں چھیرا تھا،“ فرشی اللہ یار نے ایک بار پھر اپنے بڑے پن کا مُنظاہرہ کیا۔

”سنئے تو میں سویا تو خوب منے سے مگر آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ ایک بار ایک صایہ میرے دروازے کے سامنے سے گذرنا، دوسری بار یہ صایہ میرے دروازے کے سامنے یوں رُک گیا جیسے جھر دیں میں جھاہنگ رہا ہے، میں فوراً باہر آیا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔“

”راجہ اس سے پہلے بیگماں کے ناں آیا یا بھی میں بھی،“ فرشی اللہ یار نے تفتیش شروع کی۔

”بعد میں بھی،“ یونس نے جواب دیا۔

”تو پھر وہ بیگماں ہو گی۔“ فرشی اللہ یار بولا۔ ”آپ نتے نتے آتے ہیں نا۔ اس نے

وہ جائزہ میتی پھرتی ہو گئی کہ کہیں کوئی جاگ تو نہیں رہا۔ ٹوٹی راتوں کو تو سکتے ہی سو جاتے ہیں، اس لئے کم نختوں نے ملقاتوں کا بڑا مناسب وقت پُن رکھا ہے مگر بیگماں کو آپ کا کیا اعتبار ۔۔۔ یقیناً بیگماں ہو گی۔“  
”وہی ہو گی۔“ یونس بولا۔

تفریح کے مقام میں منتشری اللہ یار کے ہاں کھانا کھا کر یونس مفلہینے کے ہمانے تھر چلا آیا۔ بیگماں کا دروازہ گھلدا تھا۔ اُس نے پٹ آنا پاہا۔ مُرجہب تک وہ پلٹنے کا فیصلہ کرتا، اپنے صحن میں ٹھرا آیا تھا۔ بوڑھی نوران چھپر کے قریب پیر ہی پر بیٹھی دیوار سے یک لگائے حصہ پی رہی تھی۔ یونس کو دیکھتے ہی شو۔ مجاہدیا۔“ ایلو میں ابھی ابھی سورج رہی تھی کہ میرا منتشری آتے تو پوچھوں کیا تیرے پاس جوڑوں کے درد کی کوتی گوئی ہے؟ اے میں صدقے تو تو خضری عمر پا رے گا۔ اللہ اقبال بڑھتے، اللہ ترقیاں دے۔“

”یگوں تو ہے خالد،“ یونس بولا۔ ”مگر جوڑوں کے ودد کی نہیں سر کے ودد کی ہے۔“  
”اے سُمِ اللہ پھر دُر دُکا ٹپاٹخ سر میں ہی ترچھوڑتا ہے۔“ نوران نے اپنے سوکھلبے بازو اٹھا کر دوڑوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام لیا۔ ”جوڑوں میں یہ درد سر کے راستے ہی تو اترتا ہے۔ میں تو صحیح سے کٹے ہوئے گوشت کے ڈھیر کی طرح پڑی ہوں، مجھا حلقہ پی رہی ہوں۔“ اُنہر ٹوپی میں ایک چنگاری تک نہیں رکھ سکتی، اور وہ کتیا کی اولاد، بالتو، اُنہیں کی نسوان نہ ریدنے لگی ہے تو وہیں کی ہو کر رہ گئی ہے۔ اے تیرے نچے چیئیں ایک گولی نکال دے۔“

”ایک گولی مجھے بھی دینا نہیں جی،“ بیگماں کی آفاز آئی اور یونس ہٹر بڑا کر پٹا۔ بیگماں سکھ لے بالوں کا ایک ڈھیر سینے اور کندھوں پر ڈھیرے دروازے میں کھڑی تھی۔ مگر اس سے خوشبو نہیں آ رہی تھی۔  
”نچے کیا ہو انخوشبو آئی بیگماں،“ نوران نے پوکارا۔

”اے خالہ!“ بیگماں بولی: ”میں نے کہا آج سر دھو دیں، سر دھو کر بال سکھانے دھو پ میں بیٹھی، بال تو سوکھے گئے مگر سر کھڑا گیا ہے۔“

”خوب شو بھی تو پکڑتی ہے سر کو نہ فروں بولی اور بیگماں ہنسنے لگی۔“

یونس نے تالا کھولا، اندر جا کر گردن میں مفلڈ والا۔ ایسپر و کی تین گولیاں نکالیں، تالا بند کر کے اُس نے ایک گولی فروں کو دی اور پھر بیگماں کی طرف بڑھا۔ اس کے بعد میں سے اتنی بہت سی ٹھنڈی اور گرم لمبی ایک دوسری کو کامٹی ہوئی گزرنے لگیں کہ وہ سمجھا بیگماں تک پہنچتے پہنچتے وہ کٹ کر ڈھیر رہ جاتے گا۔ جب اس نے بیگماں کے ہاتھ پر دو گولیاں خاصے فاصلے سے ٹپکایں تو اسے بیگماں دکھاتی ہی نہ دی۔ پھر رہ جانے اُس نے کیسے کہہ ٹالا کہ ایک کھالو، ایک رکھو، پھر کبھی کام آجائے گی؟ یہ کہہ کر وہ گلی میں شرابیوں کی طرح روکھڑتا تاہُرا سا بکل گیا۔ پھر اُس نے بڑھی فروں کی آواز سُنی وہ بیگماں سے پوچھ رہی تھی: ”کیا کہہ رہا تھا تم سے؟“

یونس سن سے رہ گیا۔ بیگماں کو ایک فالتو گول دے کر جیسے اس نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا گناہ کر ڈالا تھا۔

بیگماں کی آواز آئی۔ ”کہہ رہا تھا گول پان سے کھانا۔“

تو سکیا بیگماں کو معلوم تھا کہ ایسپر و کی دوسری گولی میں یونس کی مجتہد اور ناموس دنوں سمٹ آئے ہیں!

یونس نے پڑ کر بیگماں کی طرف دیکھا تو وہ تانی بجا کر اس زور سے ہنسی کر یونس والی سے تقریباً بھاگ نکلا۔

وہ گھر کی طرف آتی ہوتی بازو کے قریب سے بھی زن سے گزد گیا اور سکول میں پہنچ کر بچوں کو ایسے ایسے لیٹیفے نہ نہ کر دہ دوٹ پوٹ ہو کر رہ گئے۔

سانپ اگر زہر میلانہ ہوتا تو پھر ان کا نہایت محبوب کھلنا ہوتا۔ کوئی بڑے سے  
 بڑا بقر افاضہ کا بچہ بھی اس کی منقصش جلد، اس کی بے آواز فمارا دراس کے لراڈ سے  
 متاثر ہوتے بغیر نہ رہ سکتا۔ مگر سانپ کے ذہرنے اُسے ایک مرد و خلوق بنادیا ہے۔  
 یونس کبھی سانپ کے پھن سے بے پرواہ کر آگئے بڑھتا اور بھی اس کی دو شاخہ زبان  
 دیکھ کر کانپ جاتا۔ دو کبھی اس کی جلد پرستے کوڑیاں اٹھا لینے پر آمد ہو جاتا اور کبھی  
 اس کی پھنکارستے درکر ہاتھوں میں چہرہ چھپاتا، وہ بیگماں کو ایس کندھے سے چوکھت کا  
 سہارا لتے اور صرف بائیں ہانگ پر زور دیتے سیاہ کپڑوں میں ملبوس کھڑا دیکھتا تو بیگماں  
 کے چہرے اور ہاتھوں سے نکلتی ہوئی شعاعیں اسے اپنے ہائے میں پکڑ دیتیں علبی بی  
 بڑی بڑی بادامی آنکھوں کی روشنی اسے اپنی گرفت میں لے لیتی، اور دھگلی میں داخل  
 ہوتے ہی مسمر نیم ما مژروں کے معمول کی طرح یون بے ارادہ قدم اٹھاتے لگتا جیسے  
 بیگماں کے دروازے کے سامنے سے دائیں طرف اپنے کوششے کا رُخ نہیں کر سکا،  
 بلکہ بیگماں کے سامنے رُک جاتے تھے اور پڑے گا، اس سے پہٹ جاتے تھے جب رات  
 اُخري دہون پر آتی اور اس کے دروازے کے سامنے سے ساتے اور ہر سے اُدھر کی اور  
 گزر پکھے ہوتے اور بھروسی میں سے جاہاں کچکے ہوتے اور رات بھر کے جاگے ہوتے دوگ  
 بھی سوچکے ہوتے تو رابح کے انتظار میں پھنکا ہوتا یونس دیکھتا کہ راجد آتا۔ وہ میدھا بیگماں  
 کی دیواری میں داخل ہو جاتا، پھر بیگماں اُسے اپنے کوششے میں لے جاتی، کوشش کے کوڑا  
 سکھلتے تو دروازے کے بالکل سامنے ایک دیا ان دونوں کے سالوں کے خلوط کو  
 واضح کر دیتا۔ پھر کو اڑ بند ہو جاتے، دیا بچھ جاتا۔ رات ستائی کے شکنخے میں آ جاتی۔  
 سارا گاؤں دم سادھ دیتا اور یونس کا جسی پاہتا کہ وہ بیگماں کے صحن سے اس کے صحن کو  
 جُدا کرتی ہوئی ذرا سی دیوار کو پھاند جاتے اور اس کے کوششے کے بند کو اڑوں پر زور  
 سے تھوک دے اور پوری وقت سے چلا کر کہے۔ ”بد ذات، بد معاش، بد چلن۔“

پھر اس کا درست کو جی چاہئے گلتا۔

صبح ہو جاتی، بانوسر پر مشی کا ایک برتن رکھے اڑوس پڑوس سے لشی جمع کرنے چلی جاتی۔ بوڑھی نوراں ایک ہاتھ میں حلقہ اور دوسراے میں پڑھی لئے دھوپ میں اس جگہ آٹھتی جہاں سے وہ دھوپ کے ساتھ ساتھ مرکتی ہوئی شام کو اپنے کوٹھے میں چلی جاتی۔ رغیان مرنے والوں سے نکل کر گھوروں کی طرف یون پکتے بیسے رات وہاں ان کے لئے کوئی غبی ہاتھ انج کی نیچیاں بھیر گیا ہے۔ میراثیں اپلوں کے لئے گورن جمع کرنے نکل جاتیں، ان کے ٹھٹھرے ہوتے پختے یونس کے کوٹھے میں جھائختے ہوتے اپنی ماڈیں بہنوں کے بتائے ہوتے کاموں پر روانہ ہو جاتے، کوئی دھواں چھوڑتے ہوتے اپلے پر ایک انگارہ رکھتے واپس آتا۔ کسی کے بازوں میں چوڑھا گرم کرنے کیلئے باعمرے کے سو کھے ٹانڈے ہوتے، کوئی سستی سے بھروسے ہوتے پیالے کو مارے اختیاط کے چکلا کا تاہم تو انھے نئے قدم اٹھاتا یونس کے سامنے سے گزر کر غائب ہو جاتا جس روز راجد بیگماں کے پاس آتا، اس روز وہ بہت دیر سے اٹھتی، یا کم از کم یوش کو وہ تفریخ کے وقٹے سے پہلے تک دکھاتی نہ دیتی۔ لیکن جس روز وہ نہ آپاتا، بیگماں سورج کی پس کوئی کسے ساتھ بھی ڈیوڑھی کے دندوازے پر آکھڑی ہوتی، اس کے باوں کا ڈھیر اس کے کندھوں اور سینے پر بکھرا ہوتا۔ دنوں ساتھوں کی انگلیاں چنسا کر انہیں اٹھا کرتی اور بازوں کو سر پر لے جا کر لمبی لمبی انگوڑا آیاں لیتی تو کامے کر تے کی کھلی آئیں۔ اس کے کندھوں پر گر ٹپتی اور اس کے سڈ دل بازو چک اٹھتے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ وہ آئی، در دوازے پر کھڑی رہی اور یوش کے کوٹھے کی طرف دیکھیے بغیر انہ چلی گئی۔ لیکن ہسب بھی وہ یوش کی طرف دیکھتی، یوش اس کی طرف بڑی بے حیاں سے دیکھ رہا ہوتا اونچتا میں بھاکر اور قہقرہ مار کر اندر چلی جاتی۔

ایک بار وہ قہقرہ مار کر اندر جانے والی ہی تھی کہ ادھر سے بانوستی کا

برتن سر پر رکھے ہی گئی اور بولی۔ ”کیا بات ہو گئی بیگماں؟“  
اور سنتی ہوئی بیگماں نے یونس کی طرف با تھا کہ کہ دیا۔ ”کچھ نہیں بانو نشی جی  
کو دیکھ کر نہیں آگئی تھی کہ اکیلا چاہتے آدمی ہر چال ہے چڑا، کیسا الٹا لٹا لگتا ہے، ہجی چاہتا ہے  
الٹھا کر سامنے بٹھا دو اور کہانی سنائے گو۔“

پھر دہ زرد سے سنتی ہوئی اندھا گگتی اور بانو میںے سانو لے چھرے پر دھولی  
اڑاتی ہوئی سیدھی یونس کے دروازے پر آگر بولی۔ ”سن اضشی جی، بیگماں کیا کہہ رہی تھی؟“  
یونس ابھی یہ فیصلہ نہیں کر سایا تھا کہ دہ بیگماں کی بات شُن کر خوش ہو یا اخفاہ ہو، اس  
لئے خالی غمی آنکھوں سے بانو کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”کوئی بات نہیں، پڑوسن سے  
اس کا حق ہے جو چاہتے کہے لے۔“  
”پڑوسن تو ہے،“ بانو بولی، اور چلی گئی۔

پھر بیکا یک یونس کو خیال آیا کہ اس نے متواتر بات نہیں کہی۔ بات کو واضح کرنے  
کے لئے وہ فوراً اہر آیا۔ بانو اپنے کو ٹھنڈے میں داخل ہو رہی تھی اور بڑھی فوراً پیرھی اور حلقہ  
لئے دھوپ میں ملختے آرہی تھی۔ لارڈ بلا میں دُور بلا میں، وہ بولی، اور یونس واپس اپنے  
کو ٹھنڈے میں آگیا۔

اس روز سنتی الشدیار بار بار یونس کو یاد دلاتا رہا کہ اس کی صحت خراب ہو رہی ہے  
اور اس کی آنکھیں سوچی رہتی ہیں اور اس کے ہونٹ تک زرد پڑتے جا رہے ہیں اس  
نے مست الست کے کو ٹھنڈے کے آسیب تک کا ذکر کیا اور کہا کہ اگر دا یک روز میں  
اسے نیامکان نہ ملا تو وہ ہال بخوبی کو اپنے گاؤں بھیج کر یونس کو اپنے ہاں لے آئے گا۔  
”یہ بھی کوئی بات ہے؟“ اس نے کہا۔ ”میں وہی آدمی نہیں ہوں۔ لیکن یہ جات کی  
کامستانی نہیں تو اور کیا ہے کہ آپ آئے تھے تو سُرخ انار ہو رہے تھے اور اب سُل  
ایک میونے بعد یوں معلوم ہوتا ہے جیسے آپ سکول میں نہیں ہیں، ہسپتال میں ہیں۔“

رات یونس نے بڑے غطراب میں گزاری، لائین کی رفتار میں پڑھنکی بھی سکو شش کی مگر آج اس کا جی نہیں لگ رہا تھا۔ چاندنی چودھویں تھی مگر اس کے دروازے کا رُخ مغرب کو تھا اس لئے چاندنی بہت دیر تک اس کے کواڑن کی جھریلوں میں سے نہ جھانکی، فرشی اللہ یار سے آسیب کا ذکر مٹن کر اس نے تسبیہ کر لیا تھا کہ آج وہ اس ساتے کو ضرور پکڑے گا، جو قریب قریب ہر رات اس کے دروازے کے سامنے سے گزرا، اور کبھی کبھی یوں، کار را جسے اندر جھانک رہا ہے، پھر جب چاندنی تیلیاں سی بن کر اس کے فرش پر منقش ہو گئی تو وہ اٹھا اور آہستہ سے دروازے کی زنجیر کھول کر واپس پنگڑی پا بیٹھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ادھر سایہ اس کے دروازے کے سامنے سے گزرے گا۔ ادھروہ پک کر کواڑ کھولے گا اور اُسے دبوچ لے گا اور شور مچا دے گا، آسیب سے مقابلے کا جذبہ اتنا شدید ہو رہا تھا کہ سکار کھول کر اور اندر را تھلے جا کر اس نے پھٹے ہوئے ڈھول پر بھی ایک ٹاٹھا مار دیا اور شہنائی بھی چھپولی۔

وہ بہت دیر تک بیٹھا دروازے کو دیکھتا رہا۔ چاندنی کی تیلیاں بہت بھی ہو گئیں مگر سایہ غائب رہا۔ ایک بار وہ باہر نکل کر صحن میں بھی گھوم آیا، واپس آکر کواڑ بھیر دیتے اور شلنے لگا۔ اے بے چینی سی ہونے لگی، پھر نکایا اُسے باہر بہت سے آدمیوں کی آوازیں سنائی دیں۔ آہستہ سے کواڑ کھولے تو دبادبا شور واضح ہو گیا۔ پست دیوار کے پاس جا کر اس نے بیگماں کے گھر میں جھانکا، پائی چھاؤنی بیگماں کے کوٹھے کے دروازے پر جمع تھے، دروازے کا رُخ مشرق کوتا، اس لئے وہاں انہیں تھا۔ پھر دروازے کسی نے دوبارہ تھدا را اور آواز آئی۔ دو فوٹن لو۔ بیگماں اور راجے، تم دونوں سُن لو کہ آج تمہاری زندگی کا آخری دن ہے، ہم اللہ نواز کو بلانے جا رہے ہیں تاکہ اپنی بہن کا بند دلست وہ خود کرے۔ جب تک وہ آتا ہے تم چوچا ہو۔

کرلو، اس کے آنے کے بعد تو اس کی تبر ہو گی اور تماری گردی میں ہوں گی غصب خدا  
کا۔ چٹی چاندنی میں بد معاشریاں ہو رہی ہیں۔ گناہوں کے گناہوں کو پایہ کر ڈالا ہے تماری  
حفاظت کے لئے ہم نے باہر سے گندھاگا دیا ہے، جب تک مزے کرو، پھر وہ  
ہنسا اور چاندنی میں کھڑے ہوتے لوگوں کے پاس آگیا۔

یونس نے کان دھکر کر دینا، اندر سے کرنی جواب نہ آیا۔ بیگماں اکیلی ہوتی یقیناً  
کڑاک کر جواب دیتی، تو پھر راجہ بھی اندر ہی ہے اور دروازہ باہر سے بند ہے اور  
ایک دوسرا ہے میں گھس کر گھس رکھ پھر کرتے ہوتے آدمیوں سے ایک آدمی کٹ کر  
ڈیورھی کی طرف جا رہا ہے وہ یقیناً اللہ فواز کو بلا نے جا رہا ہو گا۔

یونس دیوار پر سے ہٹ آیا اور جب وہ آدمی گھلی میں نکل گیا تو یونس اپنے  
کوٹھے کے دروازے کے پاس سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ یہاں ایک دوڑپ کر اٹھا میرا شیوں  
کے چھپر میں سے ایک بلی سی کلڑی پھینکی اور باہر بھلی میں بھاگ نکلا۔ گھوم پھر کر وہ  
بیگماں کے کوٹھے کے پچھوڑے تک پہنچ گیا اور کچھ دیوار پر بھاری کٹڑی کی ضرب میں  
لگانے لگا۔ دھم دھم کی یہ مسلسل آواز رات کے سناٹے کو گونجا گئی اور بیگماں کے  
صحن میں کھڑے ہوئے دوگ یہ سوچ کر کوٹھے کے پچھوڑے کی طرف بھاگ کر راجہ  
اور بیگماں دیوار میں نقب لگا کر بھاگ نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

بہت سے قدموں کی دھب دھب سُن کر یونس کلڑی اٹھاتے ایک اور  
گھلی میں نکل گیا اور پھر کٹڑی پھینک کر سر پٹ بھاگا۔ بیگماں کے پچھوڑے کی گھلی  
کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے پٹ کر دیکھا کہ دوگ ابھی دہیں جمع ہیں۔  
پھر وہ بھلی کی سی تیزی سے اپنی گھلی میں آیا اور بیگماں کی ڈیورھی میں داخل ہوئے  
ہی لگا تھا کہ کسی نے اس کی کمر میں باز ڈال کر اسے دایتی طرف اپنے کوٹھے  
کے صحن میں گردایا، اسے گلنے والا بھی ساتھ ہی گرا، وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر

پھر دیں کھڑا رہ گیا۔

لہیں بالو ہوں۔ بالو۔ میں اونہ کوئی نہیں ہوں۔ میں بالو ہوں۔ بالو نے اٹھتے ہوئے کہا، اکٹھے بہت سے بھاگتے ہوئے آدمیوں کے قدموں کی آواز قریب آئے لگی تو بالو نے یونس کو ڈالتے سے کپڑا اور اُسے ایک جھکے کے ساتھ اس کے کوٹھے میں لے آئی پھر لوگ ادھر بیگماں کی ڈیلوڑھی میں داخل ہوئے۔ ادھر بالو نے یونس کے کوٹھے کا دروازہ بند کر دیا اور وہ یونس کے دونوں ہنخ پکڑ کر ہانپتی ہوئی بولی۔ انکرنا کرد منشی جی بھبھ تھ پھر سے سکڑی کھینچ کر بھلاگے تو میں جانتی تھی تم کہاں جا رہے ہو، پھر جس بیگ دھم دھم سن کر باہر پکے تو میں نے جا کر بیگماں کے دروازے کاٹنڈا اکھوں دیا اور اُسے تبا دیا کہ یہ میں منشی جی کا ہام کر رہی ہوں، جو پچھواری میں تمہاری دیوار کوٹ رہا ہے، میں دباؤ سے رجھ کو منکال کر باہر سے کٹدا رکا آئی ہوں، اب اندنواز آئے گا تو کوٹھے میں بہن کو اکیلا دیکھ کر وہ بیگماں سے کچھ نہیں کہے گا، اب تو اس کی تحران لوگوں پر اٹھتے گی جن پر بیگماں نے سو بار تھوکا ہے اور آج اس سے بدھ پچکانے آئے ہیں۔

بوکھلاتے ہوئے یونس نے ایک لمبی گھری سانس لے کر بالو کی طرف دیکھا اور پارے اس کے نر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کچھ سمجھے بغیر بولا۔ “تم تو بڑی اچھی نکھلیں بالو!“ لا لیئن کی روشنی میں بالو حیران سی ہو کر یونس کو بہت بہت دیکھنے لگی، پھر دہ ایک نرم پھوٹ پھوٹ کر ردہ دی اور یونس سے چمٹ گئی، وہ اپنا چہرہ اس کے سینے پر رکھا تو رہی، اس کی گردن اور ٹھوڑی چوتھی رہی، اس کے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر انہیں کھنچتی رہی، اور کہتی رہی۔ “یوں بھی ہوتا ہے منشی جی، تم بیگماں کو چاہتے ہو۔ میں تمہیں چاہتی ہوں، تم نے بیگماں کی مدد کرنی چاہی، میں نے تمہاری مدد کروی۔ میں نے تو تمہاری نہیں تو پرسرے دیتے ہیں، میں تو اتوں کو ان کو اڑوں کو چوہمنی پھری ہوں منشی جی، مجھے تو تمہاری ایک ایک گھڑی کا پتہ ہے کہ تم کیا کر رہے ہو اور کہاں دیکھ رہے ہو۔ میں

نے تو ان جھرلوں پر کان رکھ کر تماری سانسون کی آوازیں سنی ہیں اور تم مدرسے گئے ہو تو  
تمارے قدموں کی خاک اٹھا کر اپنی ہاگ میں ڈال لی ہے، میں تم سے کچھ نہیں انگلی منتھی جی۔  
میں تو اب میر بھراں ایک پل کو اپنے سینے سے لگانے لگا تے پھر دل گی، تم بے شک بیگان  
کو چاہو، میں کون ہوتی ہوں تمیں روکنے والی، میں کوئی تماری پڑوسن ہوں۔“

بُت کی طرح کھڑے ہوئے یونس کے داماغ کی سناہست گدوں کی طرح پھٹ  
پڑی اور یونس کے کھاؤں پر ایک ساتھ بہت سے ہاتھ پڑے۔

باہر ایک ہجوم جمع تھا اور بہت سے دگ بیک وقت بول رہے تھے، ہم نے  
اپنی انکھوں سے دیکھا ہے کہ منتھی جی کا دروازہ کھلا تھا اور ہم سامنے سے گزرے تو بند  
ہو گیا۔ یہ منتھی کیا کرتا پھر تھا۔ کیوں چھیتا پھر تھا۔ ہم کہتے ہیں راجھے کو اسی نے بھگایا  
ہے۔ ہم اس سے پوچھیں گے ہم اس کے لگائے میں پھدا ڈال کے پوچھیں گے؟“

”پھندہ ڈال کر پوچھنے کی تو خیر تھیں مجال نہیں،“ ایک اور آواز آئی۔ ”مگر تم نے میری  
بُن کی عزت کو تماشا بنا لیا ہے تو منتھی سے بھی پوچھو، میکھا پھر میری تبر تم سے پوچھے گی۔“  
”منتھی بھتی دروازہ کھولو۔“

بانو یونس سے یوں چھٹ گئی تھی جیسے اس کی پسلیوں کو توڑ کر انہوں نے رگھس حب اما  
چلاہتی ہے۔

”دروازہ کھولو منتھی۔“ اللہ نواز پکارا۔

یونس نے پہلی بار ہاؤ کے گرد اپنا ایک بازو پیشیا اور اس کے بازوں کو چُما۔ پھر دہ  
ہاؤ کو آہستہ سے الگ کر کے اور اسے پنگڑی پر بٹھا کر دروازے کی طرف بڑھا تو  
باہر سے کسی نے دروازے پر زور کی ایک لات ماری، پھر انکھے بہت سے آدمیوں  
نے زور لگایا اور دروازہ چکھت سمیت اکھڑ کر دھڑاک سے یونس کے قدموں میں آن گرا۔  
اللہ نواز ہاتھ میں تبر تھا تے اندر آیا اور ذرا سارگ کر جیسے بلند آواز میں سوچا ہو یہ

کون ہے؟ پھر کہاں کر بولا؟ تو کون ہے؟ ۔۔۔ پھر باہر کے لوگوں سے پوچھا تو  
نے کاتھا فٹی کوارا ہے، پھر اندر یہ عورت کون ہے؟  
لوگوں نے یقیناً بدل دی۔

پھر پھوٹی ہوتی پوکے اجائے میں جب عطر کی نہایت تیز خوبصورت سے فضامیک ہی  
تھی اور بوڑھی فوداں میں گھری ہوتی اور گھنٹوں میں سرچھپا کر بیٹھی ہوتی بازو  
کی پیٹ پر دوہنڈ مار رہی تھی اور اپنے مست است کے بین کر رہی تھی۔ نشی اللدیار  
بھوم کو چیرتا ہوا آیا اور یونس کے سامنے ایک سمجھنے تک چپ چاپ گھوڑے رہنے کے  
بعد پر لفظ کو چھاما ہوا بولا: یونس صاحب! مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی۔

یونس یوں ترے سے گرا کر خاموشی سے مار کھاتی ہوتی ہو گئی اور  
ڈیور ڈھی کے در دارے پر گھری ہوتی بیگان یوں بیٹھ گئی جیسے پر پری ہے، پھر وہ گھنٹوں  
میں سرچھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور سو درج اُبھرنے تک یہ بھرگماں کے ایک  
سرے سے دوسرے سرے تک گھوم گئی کہ بانو میراث کے ساتھ پکڑے جانے کے  
بعد ما سٹر یونس پر چلن آگئے ہیں۔

---

## امانت

دوپر کے وقت زرد نگ کی آندھی اتنے زور سے آئی اور یوں اچانک آئی کہ  
 بی بی گل کا پوئیوں کا بھرا ہوا چھاہ پسے اٹ گیا اور پھر صحن میں بھاگ نکلا۔ پونیاں بھریں تو جیسے  
 ان میں جان پڑتی۔ اڑن سانپوں کی طرح ادھر ادھر لپکیں بعض نے ایک قطار کی صورت میں  
 دیوار کا سورچہ سنبھال لیا اور تڑپ تڑپ کر آندھی کا مقابلہ کرنے لگیں اور بعض جن کے قدم  
 پسلے ہی چلتے میں اکھڑنے تھے دیوار پر سے پھانڈ کر غائب ہو گئیں، بکان کا پتلا سا پیڑ  
 آندھی کے ساتھ میں یوں جھکا کر اگر ذرا سا اور جھکتا توٹ جاتا، آس پاس گھروں کے  
 آنکھوں میں بھرے ہوتے روز کے کام کا ج کے بہت دیواروں اور دروازوں سے ٹھنڈن  
 ڈکرائیں۔ بی بی گل نے سر کی سفید چادر کے دونوں پلزاروں کو ٹھوڑی کے نیچے گردہ نکالی  
 مگر ان کی سفید سفیدی میں ادھر ادھر سے نکل کر بڑی بیقراری سے اٹنے لگیں۔ دُہ  
 چھاہ اٹھانے کے لئے جھکیں تو ان کے سفید گھٹتے میں ہوا بھر گئی۔ گھٹتے کو معمول پر لائیں  
 تو چھاہ پھر سے لڑھکا اور صحن کے ایک گوشے میں ڈرے ہوتے نیچے کی طرح دیکھ لیا  
 اتنے میں بادل اس زور سے کڑھا کر بی بی کو نٹی کے گھروں نے بھی تابنے کی چادروں کی طرح  
 بختے سنا تی دیتے اور وہ چھاہے اور بچی کھپی پوئیوں کو دیں جچوڑک کو ٹھنے کی طرف لپکیں،  
 کنڈی کھوبی تو ایک دم اتنی بہت سی ہوانے اندھکھس کر بر تنوں کو جھنجھوڑ دالا، اور

کوٹھے کے ایک گوشے میں اور پرستے رکھتے ہوئے صندوقوں کا یمنار دھڑ دھڑا کے رہ گیا۔  
بی بی نے دروازہ بند کرنا چاہا تو باہر سے آندھی کو اڑوں کو ٹھیریں مارنے لگی۔ بی بی نے ہاتھوں  
کے علاوہ کندھوں پر کاڑوں کا زور لگا کر دروازہ بند کیا۔ پھر مانپتی ہوئی اپنے کھٹرے کے پائے  
پر ٹکتی ہوتی تسبیح ہاتھیں لے کر حسنا اللہ کا ورد کرنے لگیں۔

بادل ایک بار پھر کرکما اور بوندیں چھپت پر گولیوں کی طرح پڑا خ پڑا خ پڑنے لگیں۔ ان  
کی آن میں پرنا لے بہ نکلے۔ بی بی گل نے تسبیح کو کھٹرے کے پائے سے لٹکا کر کھڑکی کھوئی  
تو جیسے باہر سے اس کے پاؤں کو کھنی نئے دھکا دیا۔ تڑاخ سے کھٹے اور بی بی ٹکھپے ہست  
گئیں۔ مجھک کر انہوں نے کھڑکی میں سے جھانکا۔ بھائیں کا دخت بارش کی چمٹنی کی اوث میں  
مجھک مجھک کر اور تن تن کو ہنمہار ہاتھاء ایک کوئے کو تیز ہوا اور بارش نے زور سے ٹھنڈی دی  
اندھہ بھائیں کی شاخوں میں پھٹ پھڑا تاہم اتنے کے پاس گرد پڑا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا  
دیوار کی اوث میں ہو بیٹھا جہاں پُونیاں بھیگ کر کیڑے سے بنی پڑی تھیں۔ بی بی گل نے  
ترپوش میں سے روپی کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور کھڑکی میں سے نکال کر کوئے کی طرف پھینک  
دیا، کوئے نے کھڑکی کی طرف دیکھا، پھر جیسے مشکوں سا ہو کر اڑا اور دیوار پر جا بیٹھا گر تیز  
ہوا اس کے پیچوں سے نیچے سے نکل گئی اور وہ دوسری طرف لڑکے گیا۔ بی بی کو کوئے  
کی حماقت پر منوس ہوا۔ کھڑکی بند کر کے کھٹرے پر آئیں، اور تسبیح پڑھنے لگیں۔ چند ہی  
مکے گزانتے تھے کہ اٹھیں، شوار کے پائے اور پھر چھالنے چنان اٹھا کر بھائی اور اسے سر  
پر رکھ لیا، پھر دروازہ کھول اور باہر نکل گئیں۔ بارش کا زور اچاک کم ہو گیا تھا، ایسا معلوم  
ہوتا تھا جیسے بارش کا یہ زور دار چھینٹا صرف اس نئے بھیگیا تھا کہ آندھی میں سے زد مٹی  
چوس لے جائے۔ دیوار کے پاس جا کر بی بی نے روپی کا ٹکڑا اٹھایا، اسے چوپا، ماٹھے  
لگایا اور ہاتھ بند کر کے دیوار پر رکھ دیا، پہٹ رہی تھیں کہ دروازے پر دستک ہوئی اپھریہ  
سمجھ کر کہ کوڑ ہوا سے بچے ہیں۔ کوٹھے کی طرف جانے لگیں۔ مگر دروازے پر پھر دستک ہوتی۔

لگوں ہے؟" بی بی نے پوچھا۔

"اے بی بی میں ہوں، گامی؟" آواز آئی۔

بی بی نے بڑھ کر کندھی کھولی تو بڑھی گامی سر پر ٹھاٹا صندوق رکھے اندھا گتی ادا خود ہی کندھی چڑھا کر بولی: "اے میں مر جاؤں، میری نیک پاک بی بی کو مجھ گنہگار کی خاطر بارش میں پھینگنا پڑا۔ پوتھوں کی نماذن میری نعاظر نگے پاؤں بھاگی آئی۔ اے میں کہنم تگھر سے کیسی بے وقت نخلی ہوں کہ آندھی بارش سب سر پر سے گزار کے آ رہی ہوں۔ یہ نہ سوچا کہ نخلت سے پہنے قدا آسمان کی طرف دیکھوں۔"

"اندر آ جاؤ، بی بی بولیں اور کوئی کی طرف جانے لگیں۔"

"اے میں مر جاؤں کیسا زور کا بادل کر کا تھا بی بی؟" گامی نے کوئی کے اندر پہنچ کر سر پر سے صندوق آماستے ہوئے کہا۔ "بخارے گناہ کرنے بڑھ گئے ہیں۔ یہ تو بی بی قمر ایسے آکا دکھا نیک پاک لوگ ہیں جنہوں نے دھرتی کے سینے میں سینہیں گاڑ رکھی ہیں، دندن سچ کتی ہوں، بھوٹچال آجاتے، دھرتی کروٹ بدل جاتی۔ اے میں مر جاؤں، بادل گرجاؤں میں سمجھی آسمان کے نیچے سے کوئی ستوں نکل گیا ہے، اے مولا میری توبہ ہے، اپنے قمر سے بچا۔ تیری ذات بڑی بے پرواہ ہے۔ پر ہم گنہگاروں کو اپنے قمر سے بچا۔ میں کہتی ہوں، آج کہیں ذکریں بھلی بھی ضرور گری ہے شام تک سن لینا بی بی۔ اتنی کوکب یونہی نہیں ہو جاتی کوئی بات ہوتی ہے تو بادل کر سکتا ہے۔ اے میری توبہ، گامی نے کانوں کی دلیں چھوڑ کر دلوں مانند اپنی رانوں پر دے مارے۔

"ایسا نہیں کرتے گامی؟" بی بی بولیں: "خدا ایسی توبہ سے خوش نہیں ہوتا کہ کان کھینچ جا رہے ہیں اور رانیں پیٹھی جا رہی ہیں۔ نفل پڑھا کر د، تھجھ پڑھا کر د۔ یہ بھی نہیں تو دس سورتیں تو یہی نہ نہیں یاد کرادی تھیں، دی ہی پڑھتی رہا کر د۔"

"اے بی بی میں مر جاؤں، بچھے تو دانتاں پھر بھول رہی ہے آج سکل۔" گامی اپنے

کپڑوں اور لٹوں سے پانی پھوڑتی ہوئی بولی ڈبھو سے پوچھا تو کہنے لگی۔ ہمیں بھی یاد نہیں رہ اے تیری یاد کو کتنے رے جاتی، تھے اس عمر میں بھی دس سورتیں یاد نہیں تو کیا اس وقت یاد کرے گی جب قبر میں اُگر فرشتہ حساب پوچھے گا، یہ زمانہ الگا ہے بنی بی۔ اب بادل کر دکیں نہیں تو کیا برسیں؟ اور کیا بادل یوں برتستے ہیں جیسے آج برسے ہیں؟ یوں تو اڑتی ہوئی چیل بھی بیٹ کر جاتی ہے۔ یہ سب ہمارے گناہ ہیں بل بل۔ میری بھو سے جتنا چاہے ماہیا سُن دو۔ ہمیرا نجھے کا قصہ رٹا پڑا ہے۔ پر اسے دس سورتیں نہیں آتیں۔ چلو سورتیں نہیں آتیں تو نور نامہ سی، معراج نامہ سی، وفات نامہ سی۔ پر نہیں، اُسے تو کچھ بھی نہیں آتا۔ اُسے تو بس علی حیدر کے دوہ مڑے آتے ہیں اور وہ میرا بیٹا، وہ مہرا جس نے برسوں تک تیری بکری چڑائی ہے اور ناظرہ قرآن پڑھا ہے اور جماعت کے ساتھ نمازیں پڑھی ہیں۔ وہ یہ سب کچھ سُنتا ہے اپنی بیوی سے اور کہتا ہے ذرا اور کھل کر گاؤ۔ کہتا ہے اماں کی پرواہ بکر دا، بوڑھے جب متے ہیں تو آدمی مرحاتے ہیں۔ قسم قرآن مجید کی بنی بی میں نے اپنے کانوں سے یہ ساری باتیں سنی ہیں۔ ہاتے میں مر جاؤں، جانے نجھے اور کہتے دن جسینے کا عذاب بھیں ہے؟

گامی رونے لگی تو بی بی گل بوسیں۔ اب روتی ہو گامی؟ پر یاد ہے تم بھی شادیوں، بیا ہوں پر یوں کلاک کے گاتی تھیں کہ مسجد کے چھروں میں نیٹھے ہوئے نمازی بھی تباہیت تھے کہ گامی کا رہی ہے۔ یاد ہے تم مجھ سے پلا سبق لیئے آتی تھیں تو تم نے کیا کہا تھا؟ میں نے تمہیں یہ سمجھی دیا تھا:-

اَوْلَىٰ مُحَمَّدَ بْنَ دِيَّ الْأَهَلِ حَمِيدَ بْنَ سَعْدَ الْأَخْرَادِ

جَسْ بُوْدَ كَيْتَى نَالَوْدُونْ خَدْقَتْ جَهْتَ كَيْتَازَمَادَه

او تم زمادہ کے ذکر پر بے شرمی سے ہنسنے لگی تھیں، اور تم نے کہا تھا کہ ہاتے میں مر جاؤں بنی بی۔ تمارے منز سے یہ سُن کر کیسا عجیب سالگما ہے۔ یاد ہے نا، وہ تمہارا زمانہ تھا۔ یہ

آئی کا زمانہ ہے، اب دلی گیوں ہو ۔“

”ہاتے بی بی میں مر جاؤں قسمیں کیسی کیسی باتیں یاد ہیں،“ گامی نے ناک پر انگلی کو کروائے ٹیڑھا کرتے ہوئے کہا، ”ہاتے ہاتے سچ مجھ میں نے کیسی گندی بات کی تھی۔ ہاتے میری توہہ پر بی بی، یہ بتاؤ، میں نے اپنی ساس کی اوڈیرے گھروائے نے اپنی ماں کی کتنی خدمت کی۔ سچھی سنا تم نے کہ ساس نے مجھے پاؤں دیانے کو کہا تھا، تو میں نے پاؤں نہیں دیا اس نے مجھے دس پھرے پانی لانے کو کہا تو میں دوسرے پھرے پھرے پر مچل بیٹھی۔ اس نے مجھے گالی دی تو کیا میں نے جواب میں اسے گالی دی؟ خدا کو حاضر ناظر جان کر سچ رجح بتا بی بی کہ کیا میں بھجوٹ بول رہی ہوں؟“

”نہیں نہیں،“ بی بی گل بولیں، ”چچی ہو کا ذکر چلتے تو آج سارا گاؤں تھہرا نام لیتا

ہے، یہ بات تو ہے۔“

”تو پھر بی بی کیا خدا امیرے گناہ بخش نہیں دے گا؟“

”جو پچے دل سے توہہ کرے گا اس سے بخش دے گا۔“

”تو بی بی میں نے گیت گائے سے توہہ کی تو کیا کھڑے دل سے توہہ کی؟“

”اس وقت توہہ کی جب تم گیت گا ہی نہیں سکتی تھیں۔“

”ہاں بی بی سچ کہتی ہو،“ گامی بولی یہ کوئی کھوٹ میرے دل میں ضرور رہ گیا ہے، جچی تو میرا مہر اجھے سے بالکل سوتیلے بیٹے کی طرح پیش آتا ہے۔ قرآن مجید کی فتحم ہے بی بی جب آئی پاس نہیں ہوتی تو میرے سامنے وہی ہاتھ بھر کا، کام کا بنا رہتا ہے۔ پر ادھر آئی نے ایک چمک دکھاتی ادھر مہر خاں آپے سے باہر ہوا۔ میں نے ایک دن کما۔ میرے مجھے شکر کی چائے سمت پلا یا کر، میری سانس کو کچھ ہو جانا ہے۔ کہنے لگا، میں پہلے لاث صاحب سے دوستی کر دوں بچہ، چینی کا بند دست بھی کر دوں گا، اور بی بی، جو میں بیوالہ دھوکر کوٹھے میں رکھنے لگی ہوں تو انشہ کی قدرت کیا دیکھتی ہوں کہ میری بہو اور میرا بیٹا دونوں بیٹھے

پھیل کی چاٹنے پر رہے ہیں۔ میں بس اتنی سی بات کہنے کی لگنہ گار ہوں کہ کیوں بیٹا، لاث حب  
نے یہ چینی کیا ابھی بھیجی ہے۔ بگڑ کر بولا۔ آماں تم تو جاتی ہو آئی کے پیٹ میں بچھے ہے۔  
میں نے کہا۔ بیٹا، آئی کے پیٹ میں تو بچھے ہے پر تمہارے پیٹ میں کیا ہے؟“ اس پر  
بچھے گھوڑ کے دمکھا اور بھری ہوئی پیالی اٹھا کر دیوار پر دے ماری۔  
بی بی گل دلیں ڈھان بچھے شان نے بتایا تھا کہ آئی کے ساتھ تمہاری بھوٹ نہیں تھی ہے  
پر یہ نہ رخان کو کیا ہو گیا ہے؟“

”غُدا اس کی حیاتی کمرے میرے گناہوں کا سایہ پڑ گیا ہے اور کیا ہو گیا ہے؟“ گامی  
نے کہتے کو دنوں طرف سے چکیوں سے پکڑ کر خشک کرنے کی غاطر بلا منابع کر دیا۔  
دو ہن پہلے ہم سب صحی میں بیٹھے تھے۔ میں نے بھر یعنی آں کی چھوٹی بہن کا بیاہ ہو رہا ہے  
اور آئی اس بہانے دے جوڑے پر جوڑا سلوار ہی ہے کہنے لگی۔ ”میرا انہا چھوٹا سا صندوق  
ہے سب ٹھنڈا پڑا ہے۔ اب یہ نئے کپڑے کہاں رکھوں۔ ریشم ہے اماں پر پیسے میں گے  
تو جینگر چلنی کر دالیں گے۔“ میرا کہنے لگا۔ ”میں اس کے پاس اتنا بڑا صندوق خالی پڑا ہے،  
اسی میں رکھ دو۔“ میرے تو تلووں میں سلگی اور چوٹی میں جا بھی۔ میں نے کہا۔ ”نہیں بیٹا  
میرا صندوق خالی نہیں ہے۔“ کہنے لگا۔ ”میں کیا رکھا ہے؟“ میں نے کہا۔ ”میرا  
کفن رکھا ہے۔“ اس پر دنوں چُپ ہو گئے، اور میں نے سوچا، چلو بلائی۔ کل شام  
کھانے کے وقت آئی پھر ہی رونا نے مجھی۔ میں تار گئی کہ میرے صندوق کے سوا اس  
کے کپڑے کہیں نہیں ڈکھیں گے، خود میکے سے جو صندوق کے کر آئی ہے، وہ ناہیوں  
کی کسوٹ سے بڑا نہیں ہے اور میرے اس صندوق میں تو میں جوڑے سما جائیں  
اور جب بھی جوڑے دو جوڑے کے لئے جگہ خالی رہے، پھر بی بی یہ سامنے والی  
کنٹلی کے ادھر ادھر طوٹے بننے ہوتے ہیں۔ یہ ہمارے تمہارے زمانے کی چیزیں  
ہیں، اب تو صندوق بنانے والے میں کو ٹیڑھا کر کے اور پڑھکنا جڑ دیتے ہیں اور جو

صندوق تیار ہو گی، وہ اور زمانے تھے، جب ایسے ایسے صندوق بنتے تھے، ہمگامی نے "ایسے ایسے" کہتے ہوئے صندوق بھایا، اور پھر اس پر کسی رکھ کر بٹھ گئی۔

مکمل شام مہرے نے پھر دیہی بات کہی کہ آماں آلی کو دے دو، اپنا صندوق بے چاری کے کپڑے ادھر ادھر ڈھیر پڑے ہیں۔ میں نے کہا۔ "بیٹا پہنچے مجھے مرتو لینے دو، دلوں چُپ ہو گئے، پہ ابھی آندھی سے پچھو دیر پہنچے جب وہ کوئی نہ میں بلیخی کھانا کھا رہے تھے، میں نے ان کی ہاتھیں سُن لیں۔ آلی نے مہرے کو طحہ دیا تو مہرا دللا ٹیچا رے بوڑھوں کی حرص بڑھ جاتی ہے پر میری ماں ایسی حریص نہیں ہے۔ ذرا ٹھہرو، میں اس سے صندوق خود اپنے لئے مانگ دوں گا۔" میں نے جی میں کہا۔ "بیٹا تو اُسے پڑھاتے گا جس نے تجھے جناء ہے؟" بس پھر میں نے صندوق اٹھا کر مہر پر کھا اور اپنی بی بی کی طرف چل پڑی۔ آسمان کی طرف کون دیکھتا۔ میں تو پڑ پلت کر گھر کی طرف دیکھتی آلی کہ کیسی مہرا اُکر صندوق نہ چھین لے۔ اس کے بعد بی بی جو آندھی آئی ہے تو ادھر میرے قدم زمین سے اگھرے جا رہے ہیں ادھر میرا صندوق سر پر سے اکھڑا جا رہا ہے، اب پٹلوں تو مہرا دیکھ لے گا، نہ پٹلوں تو آندھی کیسی اٹھا کر دے مارے گی پھر ایک جھوٹکے نے جو دھکا دیا تو میں چوتھا ہو کر گری اور صندوق رجھے کی دیوار کے پاس پڑے ہوئے ایک چوڑے سے پتھر پر جا گرا۔ وہ جس پر رحمادن بھر بیٹھا تھا پیتا رہتا ہے، پر قم نے کہاں دیکھا ہو گا بی بی۔ تیرا پر دہ قائم رہے، صندوق گرا تو میں نے کہا صندوق گیا بچٹ گیا۔ پہ اُنکر دیکھتی ہوں تو بی بی پتھر کے دلکھرے ہو چکے ہیں اور صندوق کا بس اتنا ہوا ہے کہ یہ ادھر والے طوٹے کی چوچی نجی ندا سی انہی چلی گئی ہے۔ بس۔ ہاتے کیسے زمانے تھے جب صندوق فولاد سے بنتے تھے۔ آج کم تو یہاں لگتا ہے کہ لوہے میں گھنی مکھی ملکر ٹین کی چادریں بناتی جاتی ہیں۔"

لی بی بی گل ہنس پڑیں۔

”ہاں بی بی۔“ گامی بھی مخطوط ہو کر بولی۔ ”آج کل کے صندوقوں پر ہاتھ رکھو تو لچکے جا رہے ہیں۔ دُہرے ہوئے جا رہے ہیں۔ اور ادھر یہ میرا شیر ہے۔“ گامی نے اپنے صندوق پر دھب سے ہاتھار کر کہا۔ پھر کی سل پر گھر اتواسے چھر پھاڑ کر چلا آیا۔ بی بی ایک بار پھر ہنسیں۔

گامی ذرا ساتگے کھسکی اور بی بی گل کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔“ یہ میرا صندوق اپنے پاس امانت رکھے بی بی۔ تیرے پاس سارے گاؤں کا اتنا بہت مالامان رکھا ہے تو ادھر کسی کو نہ میں میرا صندوق بھی ٹکادے۔ اور کہیں رکھا تو ہمرا اپنی لاڈو کے لئے اڑا لے جاتے گا اور یہاں کسی کی مجال نہیں کہ امانت کے سامان کو سونگھ بھی لے دُنیا جانتی ہے کہ یہ سامنے جو اور پرتے اتنے بہت سے صندوق رکھتے ہیں، ان میں ہزاروں کا سونا اور یشم بھرا پڑا ہے۔ بڑے بڑے ڈاکو بھی جانتے ہیں۔ مگر مجال ہے جو ادھر کا رُخ بھی کر جائیں۔ بی بی کے سجن میں قدم رکھیں تو پھر بن کر وہیں نہ گوٹھ جائیں۔ یہ ساری تیرے درود نیفے کی برکت ہے بی بی۔۔۔ تو تو ہمارے سارے گاؤں کا مان ہے میں اور کہاں جاؤں یہ صندوق کھٹکھٹراتی ہوئی۔ رکھ دو گی بی بی؟“

”کیوں نہیں رکھوں گی۔“ بی بی گل بولیں۔“ اتنے بہت سے رکھے ہیں تو کیا گامی کے صندوق میں کا نہ گئے ہیں جو نہیں رکھوں گی؟ پر مجھے کھول کے تو دکھا۔ میں اپنی قسلی کر دیں تو اپنی قسلی کر لے، تو اپنی چیزیں گن لے۔ میں تیری چیزیں دیکھوں۔“

گامی بے اختیار ہنسنے لگی، پھر ناک پر انگلی رکھ کر بولی۔“ ہاتے بی بی میں مرحاں تو تو بالکل جھوٹی بادشاہ ہے، تو کہتی ہے صندوق کھول کر اپنی چیزیں دکھا۔ یہ سامنے کٹنی میں تالا جو لگار کھا ہے تو اس لئے لگار کھا ہے کہ کٹنی میں تالا نہ ہو تو صندوق بالکل بکٹا گتا ہے۔ ورنہ میرے صندوق میں ہے کیا۔ کچھ بھی تو نہیں بی بی، جو کچھ تھا وہ ہمارے کے بیاہ پر دے دلا دیا۔ کافیوں میں یہ دو نہیاں ہیں یا ناک میں یہ خشناش بھر کا تیلا ہے۔

دہ بھی اس لئے کہ مروں تو بیٹا یہ نہ کئے کہ اب سکن کہاں سے آئے گا؟  
”تو ہے ہے، ایسا بھی کیا؟“ بی بی گل نے شکایت کی۔

”ایسا ہی ہے بی بی درست وہ لٹھ لے کر میرے صندوق کے یہ بچھے کیوں پڑ گیا ہے؟“  
گھامی بولی۔ ”کیا وہ نہیں جانتا کہ یہ میرے جیز کا صندوق ہے۔ میں تو آج بھی اسے  
کھولتی ہوں تو بی بی میں مر جاؤں جو بھوث بودوں، بچھے تو اس میں سے ہندی کی خوشبو  
آتی ہے اور ہندی کی خوشبو ایسی کافر چیز ہوتی ہے کہ بچھے تو آج بھی چکرا جاتا ہے میو  
بی بی میرے صندوق میں تو بس یہ ہندی کی خوشبو ہے۔ کہ تو کھول کے دکھا دو؟“  
”وہ نہیں نہیں، جب اس میں کچھ نہیں ہے تو ہم نے دو؟“ بی بی گل نے سمس کا بازو  
کا ٹنڈا پکڑ کر اسے اپنی طرف گھبیٹ لیا۔ چھر دیں، ہاتے اللہ تعالیٰ مج کتنا بھاری ہے؟“  
”فولاد ہے بی بی۔“ گامی خوش ہو کر بولی۔ ”مرے کا باپ ہش ہنس کر بتاتا تھا کہ  
اس فولاد سے یا اگریز کے جہاز بنتے ہیں یا یہ صندوق بنتا ہے کہ تا تھا ایک انگلی مولیٰ  
پیار ہے۔ امرت بانی کی بیٹی میں وہ جو لوہے کی پیٹی گردی رہتی تھی۔ پر قم نے کہاں دیکھی  
ہو گئی بی بی۔ میں نے دیکھی تھی۔ ڈاکو آتے، دو کان دوٹی۔ پیٹی پر تھوڑے بر ساتھ ہے  
پر بھال ہے جو بھوث کا ایک ناخن برابر بھی نشان اُبھرا ہو۔ میں اس صندوق کو اس  
پیٹی کا بیٹا سمجھ لو رہا۔“

”بس ٹھیک ہے،“ بی بی گل مسکرا کر بولیں۔ ”رکھا رہے۔ اشار اللہ محفوظ  
رہے گا۔“

”اے بچھے خدا ایمان نصیب کرے۔“ گامی نے گھٹنوں پر ہاتھ روک کر اٹھتے  
ہوتے کہا۔ ”ایک بات کہوں بی بی تیرا در ایری بکری چڑا تار جائے۔ چھوٹا سا تھا تو  
اندر بھی آجائا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ تیرا در دوازہ کھکھٹانے کا حوصلہ کرے اس صندوق  
کی خاطر۔ سو وہ ایسا کرے تو اسے کھلا دینا کہ جانہیں دیتے۔“

”وہ یہاں نہیں آئے گا۔“ بی بی گل نے اعتماد سے کہا اور صندوق گھسیٹ کر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔

گامی نے بڑھ کر دروازہ کھولا تو کچھ اس طرح بول جیسے کسی بزرگ کے روشنے کا دردرازہ کھولا ہے۔ اے میں قربان جاؤں تیری قدر قوں کے۔ اے میں صدقے جاؤں۔ لے دیکھ بی بی۔ باہر دیکھ، آسمان بالکل نیلا چمچ ہو رہا ہے اور دنہوپ پسلی ہوتی ہے اور ہنزا یوں بند ہے جیسے کبھی چلی ہی نہیں تھی۔“

”اللہ کی شان ہے!“ بی بی گل نے دروازے سے باہر جھاہنک کر کہا۔

گامی صحن میں چلی گئی۔ پھر پڑے دروازے کے پاس رُک کر ٹکاری۔ اے بی بی مجھے والنس بھول رہی ہے۔ اس کا سبق لینے آؤں گی کل پرسوں۔“

”اچھا۔“ بی بی گل بولیں۔ پھر انہوں نے مصلی بھایا، کونہ اٹھا کر پاؤں دھونے اور فائز کی نیت باندھ کر کھڑی ہو گئیں۔

بیوہ ہونے کے بعد پندرہ بیس دن تک تو بی بی گل درود شریف پڑھ پڑھ کر اپنے شوہر کی روح کو ثواب پہنچاتی رہیں مگر پھر یکاک ایک پڑوسن کو دیکھتے ہی انہیں خیال آیا کہ ایک پرخہ خرید لینا چاہتے ہیں۔ دوسری جیسا میں تو باقی عمر اپنے بھجوں سے باتیں کرنے میں یا اپنے پوتوں کے پالنے جھلانے میں گزار دیتی ہیں۔ مگر بی بی گل تو تنہائی کی درزیں پکڑنے والی ان کھجروں ہی سے محروم تھیں، ان کے جسب پہلا بچہ ہوا تو مری مرتی بچیں اور جب وہ بچے گیئیں تو بچہ مر گیا۔ بچے کے ماتم کے ساتھ ساتھ انہی سیاںیوں سے دودھ خشک کرنے کے ٹوکنے پوچھتی پھریں جن سے کچھ دن پہلے انہوں نے دودھ آٹانے کے نئے معلوم کئے تھے۔ چند برس کے بعد ان کے ہاں ایک اور بچہ ہوا مگر وہ مردہ پیدا ہوا اور وہ ہوا میں ہاتھ پھیلا کر رہ گئیں۔ انہوں نے غازیں پڑھ پڑھ کے اپنے مانچے پر چلتے پھر لمبی محاب ڈال لی۔ درود شریف اور استغفار شریف

کے کئی لاکھ نکالے۔ مگر جب وہ کچھ نہ کر رہی ہو تھیں تو انہیں ایسا محسوس ہوتا کہ  
وہ کہیں بہت اونچائی سے نیچے گر رہی ہیں اونہ کوئی سہارا ڈھونڈنے کے لئے ہوا  
میں ہاتھ پھیلائے ڈوبی جا رہی ہیں۔ رومنی کے گلے کے سے ایک ننھے ہاتھ کیلئے  
وہ ہواں کو ٹھوٹلی ہوتی ڈوبی میں جاتی۔ مگر اس فلام کی تہ کو کبھی نہ چھپو پاتھی۔  
اپانک نماز کا وقت ہو جاتا اور وہ جیسے ایک ڈراقتے خواب سے چونک کر  
کو زدہ اٹھا لیتی۔

پھر ایک روز کوئی گسان عورت ان کے پاس آئی اور ایک صندوق میں  
بھرے ہوئے زیورات بن بی گل کے پاس امانت رکھ گئی۔ شوہر نے بہت سمجھایا کہ  
”ویسے بھی ہمارے ہاں اللہ کا دیبا بہت ہے اس لئے سارے علاقوں کے چوریں  
کی نظریں ہمارے گھر پر ہوں گی۔ اور پرست قم نے سینکڑوں روپے کی یہ امانت لاد دی۔  
کوئی ڈاکو آدمی کا تو دو بوڑھے کیا بگار ڈالیں گے اس کا اور لوگ کہیں گے کہ ڈاکو نہیں  
پڑا ہنود کھا گئے۔ یہ نیا جمال مت پالو، یہ تو پہنچپروں کے کام ہیں۔“ مگر بن بی گل تو اسات  
کے اس مال کی بیوں دیکھ بھال کرتی تھیں جیسے ماں بچے کی کرتی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ  
ان کے پاس امانتوں کے ڈھیر لگنے لگے اور حالت یہ ہو گئی کہ دوسرے گاؤں کی  
عورتیں بھی سفارشیں کرائے اپنا مال بن بی گل کے پاس جمع کر جاتیں۔ شوہر نے کچھ  
دن تک ڈوکا، مگر جب دیکھا کہ بن بی امانتوں کی دیکھ بھال میں بالکل محبوہ کر رہ گئی ہے  
تو پھر سادھی۔ پھر جب شوہر کا انتقال ہو گیا تو بن بی گل ایک بار پھر کہیں بہت  
اونچائی سے نیچے گز نے لگیں اور ہوا میں ہاتھ پھیلائے کر رہ گئیں۔ کوئی پندرہ میں ان  
بعد ستان پڑو سن ان سے فور نامے کا سبق لینے آئی تو ساختہ ہی اپنا چرخہ بھی اٹھا  
لائی۔ ادھر اپنے پولے منہ سے فور نامے کا سبق رٹ رہی ہے۔ ادھر گھوں گھوں  
چرخہ چل رہا ہے، ہستھی گھوٹتی ہے۔ تخلا چکراتا ہے۔ پولن کی رومنی دھاگا نبنتی ہے۔

اور دھاگا تنگلے سے لپٹ کر چھلتی میں بن جاتا ہے۔ اسے ستان مجھے بھی ایک چرخہ لادے یعنی بی بی گل نے کہا اور ستان ہٹنے لگی۔ ہٹلے بی بی تو کیا کرے گی چرخہ کات کر تیرے ہاں کیا کمی ہے چادروں اور کھیسوں کی؟ مگر بی بی گل نے چرخہ خرید ہی لیا اور ہٹوا میں پھیلے ہوتے ہاتھوں نے تھی اور پولی منجھال لی۔

اب ستان کا چرخہ بھی انہی کے ہاں رکھا رہتا۔ ستان کو جب بھی مدد ملتی، رشکتی ہوئی آتی۔ گاؤں بھر کی نئی نئی خبریں سناتے ہوتے چرخہ منجھال لیتی۔ بی بی گل بھی چرخہ لے بیٹھتیں۔ وہ بہت سا سوت کات کر لوڑ ہافوں کے حوالے کرتیں۔ چادریں اور کھیس ہٹوانیں اور انہیں طالب علموں اور مسافروں کے لئے مسجد میں بھجوڑیں لیتیں۔ میں کس کے لئے جمع کروں۔ وہ ستان کے ٹوکنے پر کہتیں۔ چیزیں آل ولاد کے لئے جمع کی جاتی ہیں اور میرے بعد قوبی اللہ ہے۔ پھر وہ زور زور سے چرخہ گھمانے لگتیں۔

انہی دنوں ان کے ہاں ایک چور امانتوں کا مال چوری کرنے آیا۔ کیس سے کوڈ کر بی بی گل کی چھت پر اُترا تو راؤں تک چھت میں دھنس گیا۔ چھت کی لکڑیوں نے اس کی رانیں اور چیرڑالیں اور وہ بیووش ہو کر دہیں بچھسارہ گیا۔ صبح کو وہ گوں نے بی بی گل کی پاکدا منی کا یہ معجزہ دیکھا تو سُبحان اللہ کہہ کر رہ گئے۔ اس کے بعد کسی چور کو ادھر کا رُخ کرنے کا حوصلہ نہ ہٹوا اور بی بی گل سارے علاقوں کی مقدس اور محترم ہستی بن گئیں۔

گامی کے جانے کے بعد وہ آخری رکعت پڑھ رہی تھیں اور الشیات بیٹھی تھیں۔ جب ستان آئی اور چرخہ کر بیٹھ گئی۔ سلام پھر نے اور دُعا مانگنے کے بعد انہوں نے ستان کی مدد سے گامی کا صندوق ایک طرف چایا اور اسے ایک پڑبے سے خشک کرتے ہوتے بولیں۔ رستے میں بیچاری کو بارش نے آلیا۔ صندوق

بھیگ گیا ہے۔ خشک نہ کیا تو زنگ لگ جاتے گا۔“

پھر انہوں نے ایک کندورا بُنھا کر صندوق پر چھلدا دیا اور ایسی آسودگی سے پڑھ کاتے بیٹھ گئیں، جیسے ان کی شخصیت کی سکھیل کی راہ میں فقط گای کے اس صندوق کی کمی حائل تھی۔

لگائی اس کے بعد کمی ہار آئی۔ بھولی ہوتی والنس یاد کی، نور نامے معراج نامے اور وفات نامے کا آموختہ درجنوں پار ڈھرا رہا۔ وہ ساتھ ساتھ اپنے صندوق کے فصیبوں پر بھی عشق عیش کرتی رہتی کہ ہاتے میں مر جاؤں۔ کیسا صاف سخرا، پچھتا دکھتا، ڈھپا ڈھپایا رکھا ہے، اور انہوں نے کے قابوں میں آ جاتا تو طبرٹے کھوئے ہیں پچھے ہوتے اور اندر آئی کے وہ سپرے رکھتے ہوتے جن کا آگاہ بیچا یا غدرا جانے یا درزی جانے تیرے نام میں ایسا جادو ہے بی بی کہ صبر کے کوئی ایک بار اپنے صندوق کا پتہ بتایا کہ وہاں رکھا ہے جب سے مجال ہے جو اس نے چوں بھی کی ہو۔ دنیا بھمان کی بات ہو گی۔ صندوق کی نہیں ہو گی۔ اس کے لئے صندوق اس کے باپ کی طرح مر چکا ہے۔“

لگائی کی ہاتھی سُن کر بی بی بھل اور ستان خوب خوب پستیں۔ پھر وہ میئنے دو میئنے بعد صندوق کو تیل سے چھپتیں اور دھوپ میں دن بھر رکھنے کے بعد اسے گز گڑ کر صاف کرتیں۔ آذرا انت ہے بی بی کستیں۔ امانت رکھنے والیاں اپنی چیزیں مجھے نہیں دے جاتیں اپنے مولا کے حوالے کر جاتی ہیں۔ پھر میں خدا کے پاس رکھی ہوئی اس امانت کی خدمت کیوں نہ کروں۔“

ایک دن دوپر کے فریب شاہ آئی اور اپنے چرخے کے پاس بیٹھ کر پونیاں بنانہا کر چاہے میں رکھنے مگر۔ اس وقت بی بی بھل مصلتے پر بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھیں۔ ایک پوری تسبیح گھملنے کے بعد انہوں نے چار طرف پچھوہ کی اور شاہ کی طرف

دیکھا۔ کہ کوستاں کیا حال ہے گاؤں کجا ہے؟ ”بس رہا ہے بی بی تیرے دم سے“ شان بولی۔ ”میں قوجہ ہر دلخیثی ہوں تیرے ان سفید بالوں کافور چار طرف پھیل رہا ہے۔ پھر یکایک ادھوری پونی کو روئی کے ڈھیر میں ٹھونس کر بولی۔ ”اے بی بی۔ پڑتے ہے گامی استے دنوں سے کیوں نہیں آتی؟“

”کیوں نہیں آتی؟ بی بی گل نے پوچھا۔

اور شان بولی۔ ”بے چاری کوپالی کے درد نے چُوس کے ڈال دیا ہے۔“  
”کب سے؟“ بی بی گل پر شان سی ہو گئی۔

شان بولی۔ ”یہ تو میں نے نہیں پوچھا کہ کب سے پڑا لگتا ہے کہ آج بیچاری کا آخری دن ہے۔ آلی ہٹی سے دوا لئے جا رہی تھی۔ میں نے پوچھا، کیسی ہے گامی بولی۔  
بس پل چلا دلگتا ہے۔ ابھی ابھی تو زبان بھی بند ہو گئی تھی۔ پھر تجھے سے گرم گرم چاتے منہ میں ٹپکائی، تو ذرا سی بولنے لگی اور بی بی فُدا کی قسم بیچاری لڑکی یہ بتا کر رونے لگی۔ اب سوچ دو ہو کا یہ حال ہے تو بیٹے کا کیا عال ہو گا۔ میں تو کہتی ہوں گامی خواہ مخواہ دو نوں کے یہ تجھے پڑی رہتی تھی۔“

”تو یہ بات ہے“ بی بی گل نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ پھر سیل پر سے بُر قع اُمار لیا اور بولیں۔ ”چل شان، گامی کو اس کا صندوق دے آئیں۔ زندگی موت کا کوئی پہ نہیں۔ بیچاری موت کی نشانی ہوتی ہے۔ میں تو ہمیشہ ڈرتی رہتی ہوں کہ اگر کوئی اچانک سر جاتے اور اس کی امانت میرے پاس رکھتی رہ جاتے تو میں اس کے دارثوں کو کیسے یقین دلاؤں گی کہ اس کے میں یہی کچھ تھا اور کچھ نہیں تھا۔“

شان چھا بے پر ڈھکنا رکھ کر کھڑی تو ہو گئی۔ مگر بولی۔ ”بی بی۔ ذرا سادن ڈھل لے تو چلیں۔ ابھی تو دو پر بھی نہیں ہوتی۔ گلیاں پل رہی ہیں، تجھے تکلیف ہو گی۔“  
”اور اگر گامی اس سے پہلے چل دی؟“ بی بی گل نے بُر قعے کا اگلا حصہ مانچہ پر سے

اُٹھتے ہوئے کہا۔ اگر اس کے بعد اس کی بُہُدیا بیٹھا پر کمہہ ڈالیں کہ بی بی سارا مال گھر میں رکھا آتی ہے اور خالی صندوق اٹھالا فی ہے تو۔۔۔

”ہاتے ہاتے بی بی۔ تو یہ قوبہ کرو۔“ ستان نے گامی کے صندوق پر سے کندورا اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ لیکن کسی کی موت آئی ہے کہ وہ تجوہ پر تمہت بامدھے سزا بان جل کر کوئلہ نہ ہو جائے آن کی آن میں۔“

”نہیں ستان۔“ بی بی نے صندوق کا ایک کنٹا پکڑ کر اسے ایک طرف سے اٹھایا۔  
”سانس کا کوئی اعتبار نہیں، چل اٹھو۔“

”صندوق ستان کے سر پر رکھ دیا گیا اور حوصلی کے دروازے کو مقفل کر کے دلوں گامی کے گھر کی طرف چل پڑیں۔ ٹھیکیوں میں سے گزرتے ہوئے دو گرقيقة میں لپٹی ہوئی خاتون کو آتا دیکھ کر دیواروں کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو گئے، پھر ایک طرف ہٹ گئے۔ خود توں نے بی بی گل کے برقبے کو پہچان کر، ”رُد بلا یعنی دُور بلا یعنی“ کہا اور ادب سے گز گز گئیں۔

پھر بیکا یک زرد رنگ کی آنڈھی اتنے زور سے آئی اور یوں اچانک آئی کہ بی بی گل کا برقبہ پھول کر کپا ہو گیا۔ اور ستان کے قدم اکھڑے تو گامی کا صندوق وھڑ سے پتھر کی ایک سل پر جاگرا۔ آس پاس گھروں کے آنگنوں میں بکھرے ہوتے برتن دیواروں اور دروازوں سے ٹھن ٹھن ٹکرانے لگے اور منٹی کے ذرے سوتیوں کی طرح چھروں میں جھجھنے لگے۔

”والپس نہ چلیں بی بی؛“ ستان نے اٹھتے ہوئے بڑی بے بسی سے پوچھا۔  
”ہونہیں۔“ بی بی گل بولیں۔ پھر اسے صندوق سر پر اٹھانے میں مددی تو ستان بولی۔ ”ہاتے بی بی یہ دیکھو پتھر کی سل دو ہو کے رہ گئی ہے۔“

”دیواروں کے ساتھ لگ کر چلو۔“ بی بی گل بولیں۔ پہکتی دُور ہے گامی

کا گھر؟“

”کچھ ایسا دوڑ تو نہیں ہے مگر۔۔۔“

یکایک بادل اس زور سے کر دکا کر کچے مکان تابنے کی چادر وں کی طرح  
بج آئٹھے۔

”حسبنا اللہ!“ بی بی گل زور سے بولیں۔

ایک دم موٹی موٹی بوندیں پڑنے لگیں اور گامی کے گھر پہنچنے تک دونوں  
بیوں بھیگ گئیں کہ کھل کے قدم اٹھانا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ بہاس ان کے جسم سے  
چھٹا پڑتا تھا، اور بھیگ کا ہوا بر قع تو ہوا کے تھپیڑوں سے سارے راستے تالیاں  
پیٹھا رہا۔

دونوں گامی کے کوٹھے میں داخل ہوتیں تو مہرا بر قع دیکھ کر دوسروی طرف سے  
نکل گیا۔ گامی کے سرہانے آلی بیٹھی چھے سے اس کے منہ میں قطرہ قطرہ دو اپنکار ہی تھی  
اور ایک پڑوسن آہستہ آہستہ گامی کے تلوے مل رہی تھی۔

بی بی گل کو دیکھ کر دونوں ہنکا بکا سی رو گئیں۔ پھر گامی کی مدھم آواز آتی۔

”بند کر لوں منہ؟ ختم ہو گئی دارو؟“

”ماسی؟ آلی گامی پر جھک کر بولی۔ ماسی دیکھو کون آیا ہے۔“

”کون آیا ہے؟“ گامی نے پوچھا۔ ”مرا کدھر گیا؟“

”بی بی گل آتی ہیں ماسی۔ آلی بولی۔“

”ہائے میں مر جاؤں، کہاں ہے بی بی؟“ گامی کے سارے جسم میں حکمت پیدا  
ہوئی اور اس نے سر اٹھانے کی کوشش شکی۔

بی بی گل نے بڑھ کر اسے تھام لیا اور بولیں ہم تیٹی رہو گامی۔ ہو جلو نہیں ہیں  
تو بس تمیں دیکھنے آتی ہوں۔“

مگر گامی سخت بے قرار ہو گئی تھی۔ « اسے آئی، اسے بی بی کو کسی اوپنچے پنگ  
پر بٹھا، یا بچے یہاں سے اٹھا کر نیچے لٹادے۔ اری بی بی گل نہیں آتی ہے تیرے گھر  
میں فرشتہ اتراتا ہے۔ مجھ سے پوچھو یہ بی بی کیا چیز ہے اب میری مشکل آسان ہو  
گئی ہے، اب مجھے سورتیں بھی یاد آگئی ہیں۔ اب میں ذرا سلیقے سے مردیں گی۔  
ہاتے بی بی، تو میرے پاس چل کر آتی ہے۔ اسے بد نصیبو کہیں سے چینی نکالو۔  
شربت گھوں کر پلاڑ بی بی کو —»

بی بی گل گامی کے پاس ہی بیٹھ گئیں ۔ وہ نہیں گامی رہنے دو میں تو بس تھیں  
دیکھنے آتی ہوں اور تمہاری امانت تھیں پہنچانے آتی ہوں۔ میں نے سوچا زندگی  
موت کا کوئی پتہ نہیں، تمہارا ماں ہے تم تک پہنچ جاتے اور میں مُرخ رو  
ہو جاؤں۔

« ہاتے بی بی۔ تو نے میری خاطر کتنا کچھ کیا ہے؟ گامی بول۔ « بس آگیا صندوق  
میرے پاس پہنچ گئی امانت۔ ستان اٹھا کر لا لی ہوگی۔ جیتی رہو ستان۔ اے بی بی!

اللہ تجھے ایمان نصیب کرے۔

کچھ دیر تک بی بی گل گامی کو تسلیاں دیتی رہیں۔ پھر میں مکار طیبہ پڑھتے رہنے  
کو کہا اور آخر میں پوچھا۔ « گامی، ایک بات کہوں جو تو نہیں مانوگی؟ »

گامی نے اپنا ہاتھ بی بی کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔ تیری بات کا بڑا مان کر کیا  
مجھے دو زخمیں جانا ہے بی بی۔

« اچھا تو یہ بتاؤ! ۔ بی بی گل نے پوچھا۔ « تمہارا صندوق تو تمہارے پاس پہنچ گیا۔  
مگر اس کا کیا کروگی؟ کسے دوگی یہ صندوق؟ »

گامی نے جیسے ہنسنے کی کوشش کی۔ مگر اس کوشش میں ناکام ہو کر بولی۔

« ہاتے بی بی میں مر جاؤں۔ تو بھی کیسی بھولی باڈشاہ ہے۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات

کا گھر، ”

”کچھ ایسا دور تو نہیں ہے مگر۔۔۔“

یکایک بارل اس زور سے کر کا کر کچھ مکان تابنے کی چادر دل کی طرح  
بج آئھے۔

”حسینا اللہ!“ بی بی گل زور سے بولیں۔

ایک دم موٹی بوندیں پڑنے لگیں اور گامی کے گھر پہنچنے تک دونوں  
یوں بھیگ گئیں کہ کھل کے قدم اٹھانا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ لباس ان کے جسم سے  
چھٹا پڑتا تھا، اور بھیگنا تو ابر قع تو ہوا کے تپیریوں سے سارے راستے تالیاں  
پہنچتا رہا۔

دونوں گامی کے کوٹھے میں داخل ہوتیں تو مرا بر قع دیکھ کر دوسری طرف سے  
بخل گیا۔ گامی کے سرہانے آئی بھیچی چھے سے اس کے مذہ میں قطرہ قطرہ دو اپنکار ہی تھی  
اور ایک پڑوسن آہستہ آہستہ گامی کے تلوے مل رہی تھی۔

بی بی گل کو دیکھ کر دونوں ہر کا بکھاری رہ گئیں۔ پھر گامی کی مدھم آواز آئی۔

”بند کر لوں منہ، ختم ہو گئی دار وہ۔“

”اسی؟ آئی گامی پر جھک کر بولی۔۔۔ ماسی دیکھو کون آیا ہے۔“

”کون آیا ہے؟“ گامی نے پوچھا۔ ”مرا کدھر گیا؟“

”بی بی گل آتی ہیں ماسی۔ آئی بولی۔“

”باتے میں مر جاؤں کہاں ہے بی بی۔۔۔ گامی کے سارے جسم میں حرکت پیدا  
ہوئی، اور اس نے سر اٹھانے کی کوشش کی۔

بی بی گل نے بڑھ کر اسے تھام لیا اور بولیں ”تم لمی رہو گامی۔۔۔ ہو جلو نہیں۔۔۔ میں  
تو بس تمہیں دیکھنے آتی ہوں۔“

مگر گافی سخت بے قرار ہو گئی تھی۔ اسے آئی، اے بی بی کو کسی اوپنے پنگ پر بٹھا، یا مجھے یہاں سے اٹھا کر نیچے ٹلا دے۔ اوری بی بی گل نہیں آئی ہے تیرے گھر میں فرشتہ اڑتا ہے۔ مجھ سے پوچھو یہ بی بی کیا چیز ہے اب میری مشکل آسان ہو گئی ہے، اب مجھے سورتیں بھی یاد آگئی ہیں۔ اب میں ذرا سیقے سے مردیں گی۔ ہاتے بی بی، تو میرے پاس چل کر آئی ہے اورے بد نصیبو کہیں سے چینی لکا دے۔ شریعت گھول کر پلاڑ بی بی کو۔۔۔۔۔

بی بی گل گافی کے پاس ہی بیٹھ گئیں یہ نہیں گافی، رہنے دو میں تو بس تیس دیکھنے آئی ہوں اور تمہاری امانت تیس پہنچانے آئی ہوں۔ میں نے سوچا زندگی ہوت کا کوئی پتہ نہیں، تمہارا مال ہے تم تک پہنچ جاتے اور میں مُرخ رُو ہو جاؤں۔۔۔۔۔

”ہاتے بی بی۔ تو نے میری غاطر کتنا کچھ کیا ہے؟“ گافی بولی۔ ”بس آگیا صندوق میرے پاس پہنچ گئی امانت۔ ستائیں اٹھا کر لانی ہوگی۔ جیسی رہو شان۔ اے بی بی۔ اللہ تجھے ایمان نصیب کرے۔“

کچھ دیر تک بی بی گل گافی کو تسلیاں دیتی رہیں۔ پھر اسے کلمہ طیبہ پڑھتے رہنے کو کہا اور آخر میں پوچھا۔ ”گافی، ایک بات کہوں بڑا تو نہیں ماڈگی؟“ گافی نے اپنا ہاتھ بی بی کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”تیری بات کا بڑا مان کر کیا مجھے دو زخ میں جانا ہے بی بی۔“

”اچھا تو یہ بتاؤ؟“ بی بی گل نے پوچھا۔ ”تمہارا صندوق تو تمہارے پاس پہنچ گیہ مگر اس کا کیا کروگی؟ ہے کسے دوگی یہ صندوق؟“

گافی نے جیسے ہنسنے کی کوشش کی۔ مگر اس کو شش میں ناکام ہو کر بولی۔ ”ہاتے بی بی میں مر جاؤں۔ تو بھی کیسی بھولی بادشاہ ہے۔ یہ بھی کرنی پوچھنے کی بات

ہے کہ اپنا صندوق کسے دوں گی۔ اے اپنے بیٹے کو دوں گی اور کسے دوں گی۔“

باہر آسمان بالکل نیلا چمچ ہو رہا تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی اور ہوا یوں بند تھی، جیسے کبھی چلی ہی نہیں تھی۔

---